خواتین

جس میں ۳۳ مشہور اسلامی خواتین کی سوانح عمریاں اور اُن کے مفید و مستند تاریخی حالات ہیں جو وقتاً فوقتاً دس سال تک علی گڈھ کے رسالہ خاتون میں شائع ہوتے رہے۔

مؤلفہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

سنگم کتاب گھر
اُردو بازار دہلی

بار دوم نومبر سنہ ۱۵ء ۱۰۰۰

قیمت .... للعہ

یونین پریس دہلی

فہرست مضامین کتاب خواتین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

رسالہ خاتون کو جاری کئے ہوئے آج تقریباً دس سال کا زمانہ گزرا اس عرصے میں اس رسالے کے ذریعے سے تعلیم نسواں کی اشاعت کے علاوہ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علمی، ادبی، اخلاقی، اصلاحی اور تاریخی وغیرہ ہر قسم کے مضامین کا عورتوں کے لئے ایک اچھا ذخیرہ فراہم ہو گیا جن سے مختلف قسم کے کئی عمدہ مجموعے منتخب کئے جا سکتے ہیں۔

تاریخی مضامین کے سلسلے میں دنیا کی اکثر قوموں کی نامی گرامی اور مشہور خواتین کے حالات اس رسالے میں شائع ہوئے ہیں۔ بالفعل ہم نے چاہا کہ جس قدر مسلم خواتین کی سوانح عمریاں اب تک اس رسالے میں نکل چکی ہیں اُن کا ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کریں۔ تاکہ جو بیش بہا موتی جا بجا بکھرے پڑے ہیں وہ ایک لڑی میں آ جائیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس نے دلچسپی لی وہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری ہیں۔ انھوں نے اب تک برابر خواتین اسلام کے سلسلے کو اس رسالے میں قائم رکھا۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کام کو انھیں کے سپرد کردیں اور وہی ان پر نظر ثانی کر کے اُن کا مجموعہ شائع کریں۔

ہم کو امید ہے کہ اگر یہ سلسلہ خاتون میں اسی طرح جاری رہا تو آیندہ ہم مسلمان خواتین کے حالات کی دوسری جلد اور دیگر اقوام کی عورتوں کے حالات کے مجموعے بھی شائع کر سکیں گے۔

خاکسار
عبد اللہ
۲۴ اپریل ۱۹۱۴ء

(13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

طبع دوم

یہ کتاب آج سے پورے ۳۷ سال پہلے علی گڑھ سے شائع کی گئی تھی اور جیساکہ اس کے دیباچہ اول سے ظاہر ہے۔ اس میں نامور خواتین اسلام کے وہ حالات ہیں جو رسالہ خاتون میں تبغاریق شائع ہوتے رہے۔ یہ ماہوار رسالہ علی گڑھ کالج کے شعبۂ تعلیم نسواں کی طرف سے نکلتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند میں عورتوں کی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ اس مقصد میں یہ بہت کامیاب رہا، اور اس وقت کے مقبول رسالوں میں اس کا شمار تھا۔

میں اس زمانے میں علی گڑھ کالج میں مدرس تھا۔ شیخ عبداللہ صاحب وکیل نے جو شعبہ تعلیم نسواں کے ناظم تھے میرے ہی کہنے سے خواتین کے حالات اس رسالے میں شائع کرنے شروع کئے۔ وہ زیادہ تر مجھی سے

ان کے لئے فرمائش کرتے تھے۔ چنانچہ ان ۳۳ خواتین میں سے ۱۷ کے حالات میرے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ۱۴ بیگمات کے حالات مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم مرحوم نے لکھے جو میرے چچا ہوتے تھے۔ بقیہ بھی سوائے چند کے میں نے ہی اپنے پاس آنے والے لوگوں سے لکھوائے۔ اسی وجہ سے شیخ صاحب موصوف نے اس کی اشاعت کا حق میرے سپرد کیا۔ طبع اول میں اس کتاب کے صرف پانسو نسخے چھاپے گئے تھے۔ اس کے بعد پھر کبھی اسکی طباعت کی نوبت نہ آئی۔ اب بعض احباب کے اصرار سے اس کو دوبارہ چھاپنے کا خیال ہوا ہے۔ طبع اول میں خواتین کے حالات میں صرف ترتیب زمانی کا خیال رکھا گیا تھا۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ مدارج کے لحاظ سے تقسیم کر دوں۔ یعنی دینی عظمت والی خواتین کو دنیاوی عظمت والی خواتین سے الگ رکھوں۔ زبیدہ خاتون زوجہ ہارون الرشید اگرچہ عظیم الشان ملکہ ہے لیکن میں نے اس کو بیگمات سے نکال کر صالحات میں اس لئے شامل کیا ہے کہ اس کا نہر زبیدہ کا صدقہ جاریہ ایسا ہے جو اس کی بزرگی اور ولایت کی دلیل ہے۔ خواتین کے جس قدر حالات میں نے لکھے ہیں معتبر تاریخوں سے لکھے ہیں۔ بے شک حضرت خولہؓ کے کارنامے واقدی کی فتوح الشام سے لئے ہیں جس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس کی تحریر جذباتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی دوسری کتاب میں ان کے حالات مجھ کو مل نہیں سکے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ کتاب مفید ہو

اسلم جیراجپوری

جامعہ نگر، دہلی۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۵۱ء

صحابیات رض

431

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ

یہ نام جو عنوان پر لکھا ہوا ہے کسی معمولی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ اس مقدس خاتون کا نام ہے جس نے تمام مردوں اور عورتوں سے پیشتر اسلام کی روشن شاہراہ میں قدم رکھا۔ اور سب سے پہلے اس سچے مذہب کی حقیقت کو سمجھا۔ ارباب سیر اور محدثین بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے اوّل جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا وہ یہی مقدس خاتون ہیں۔

ان کے نسب کا سلسلہ اس طرح پر ہے۔ خدیجہ بنت خویلد۔ ابن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی قریشی۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ بھی قریشی تھیں۔

ان کے والد خویلد قریش میں ایک معزز سردار تھے اور سب سے زیادہ دولت ان کے پاس تھی۔ ان کے مرنے کے بعد تمام دولت حضرت خدیجہ کو ملی قریش میں ان کی بہت زیادہ عزت تھی، نہ صرف مال کی وجہ سے بلکہ نیکی اور حسن اخلاق میں بھی یہ ایک ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا لقب جاہلیت میں طاہرہ تھا۔

ان کا نکاح پہلے عتیق بن عابد مخزومی کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا۔ انھی کے بیٹے محمد مخزومی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ابوہالہ سے ہوا، جو تمیم میں سے تھے۔ اُن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، اُن کا نام بھی ہند رکھا گیا۔ وہ حضرت علی کے ہمراہ جنگِ جمل میں شریک ہو کر کام آئے۔

ابوہالہ کے مرنے کے بعد خدیجہ رضؓ نے پھر نکاح کا ارادہ نہیں کیا۔ دنیا سے ان کی طبیعت اُچاٹ تھی۔ اکثر خانہ کعبہ میں جاتیں اور وہیں اپنی عبادت کیا کرتیں۔ طبیعت کا میلان بالکل نیکی کی طرف تھا۔ اس لیے کاہنہ عورتیں جو اس زمانے میں بہت بزرگ خیال کی جاتی تھیں اُن کے پاس آتی تھیں یہ ان کی باتیں نہایت خوش اعتقادی سے سنتیں اور ان کی خاطر و مدارات کرتیں۔

بہت سے قریش کے سردار اس خواہش میں تھے کہ اُن سے شادی کریں۔ کیونکہ مالدار اور دولت مند ہونے کے علاوہ حسن میں بھی یہ تمام قبیلے میں بے نظیر تھیں۔ علاوہ ازیں اعلیٰ درجے کی منتظم اور نہایت عقیل تھیں۔ گھر کا اور باہر کا سب انتظام بہت اچھی طرح رکھتی تھیں لیکن انھوں نے پسند نہ کیا۔

قریش کا قبیلہ تجارت پیشہ تھا اور تجارت کو وہ لوگ اس قدر ضروری خیال کرتے تھے کہ جو شخص ان میں سے تجارت نہیں کرتا تھا اس کو آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ اس وقت ملک شام تجارت کا مرکز تھا۔ قریش کا قافلہ سال میں ایک مرتبہ تجارت کے لئے وہاں جایا کرتا تھا۔ حضرت خدیجہ بھی وہیں اپنے تجارتی سامان کے اونٹ بھیجتیں۔ ان پر کسی کو ملازم رکھ دیتیں اور اپنے غلاموں کو ساتھ کر دیتیں۔

ایک سال بہت ہی سخت قحط تھا اور عرب کے لوگ نہایت پریشان تھے۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "تمہارا نام عرب میں امین (امانت دار) مشہور ہو گیا ہے۔ لوگ تمہاری سچائی اور دیانت داری پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اس وقت شام کے ملک میں قافلہ جانے کو تیار ہے۔ خدیجہؓ اپنے اونٹوں کے ہمراہ ایک شخص کو اجیر (ملازم) کر کے بھیجتی ہیں۔ اگر تم اُن سے کہو تو کیا عجب ہے کہ تمہیں اس کام کے لئے وہ پسند کریں۔ کیونکہ بہت قحط ہے ہم لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ کوئی صورت آمدنی کی کرنی چاہیئے" آپ نے جواب میں فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ وہ بلا درخواست کے یہ کام میرے سپرد کر دیں" کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ میری امانت داری کی شہرت ہے۔ اور وہ امین آدمی تلاش کریں گی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں ہے کہ پہلے اُن کی نظر مجھی پر پڑے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا جب

جب حضرت خدیجہؓ نے اپنے ایک آدمی سے ابوطالب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا حال سنا تو آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں اپنے تجارتی سامان کے اونٹ آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ اور پہلے لوگوں کو میں جس قدر اُجرت دیا کرتی تھی اس کا دوگنا آپ کو دوں گی۔ یہ سن کر ابوطالب بہت خوش ہوئے۔

قافلہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی آپ کے ہمراہ کر دیا تھا اور اس کو تاکید کر دی تھی کہ امین (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ اس وقت اسی نام سے مشہور تھے) کی نافرمانی نہ کرنا اور ان کی خدمت بجا لانا۔

جب شام کے متصل پہنچے تو ایک مقام پر قافلہ اُترا۔ آپ ایک درخت کے سایے میں بیٹھے۔ اس کے قریب ہی ایک راہب (یہودی عالم) کا جھونپڑا تھا جس کا نام نسطورا تھا۔ میسرہ وہاں کسی کام کے لیے گیا۔ راہب نے پوچھا کہ اس درخت کے نیچے کون شخص اُترا ہے۔ میسرہ نے آپ کا نام لیا اس نے جھک کر دیکھا، اور میسرہ سے پوچھا کیا اس شخص کی آنکھوں میں سُرخی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ وہ فوراً ایک ورقہ توریت کا ہاتھ میں لیے ہوئے آپ کے پاس آیا شکل و صورت دیکھتا جاتا تھا اور اس ورق کو پڑھتا جاتا تھا۔ قریش کے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ کوئی

منتر پڑھ رہا ہے۔ چاروں طرف سے تلوار لے کر اس راہب کو مارنے کے لئے دوڑ پڑے۔ لیکن وہ اپنے صومعہ میں بھاگ گیا۔ دروازہ بند کر لیا اور اوپر سے آ کے کہنے لگا کہ تم لوگوں کا خیال غلط ہے۔ میں اس شخص کی صورت کو اپنے نبی کی پیشین گوئیوں سے ملا رہا تھا جس کو میں نے بالکل پورا پایا۔ یہ شخص وہی نبی ہے جس کی آسمانی کتابوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے اور یہ عنقریب برہنہ شمشیر اور لمبے نیزے کے ساتھ مبعوث ہوگا۔

اس کے بعد آپ بازار میں تشریف لے گئے۔ وہاں اموال تجارت کو فروخت کیا۔ آپ کی دیانت داری اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس سال ہر سال کی بہ نسبت دو گنے سے زیادہ نفع حاصل ہوا۔ آپ اللہ کا شکر کرتے ہوئے خوشی کے ساتھ وہاں سے واپس ہوئے۔

تمام راستہ میں آپ کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ خوش معاملگی کا تھا میسرہ جان و دل سے آپ کا مطیع تھا۔ اور جس وقت قافلہ واپس آیا تو حضرت خدیجہ کے پاس پہنچ کر اس نے تمام حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی اور نسطورا کا قصہ بیان کیا۔ اور حد سے زیادہ ان کی تعریف کی اس کے بعد سب مال و منافع پیش کیا۔ حضرت خدیجہ اس غیر معمولی منافع کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مقررہ اجرت سے بھی دگنا دیا۔

دوبارہ پھر حضرت خدیجہؓ نے یمن کے بازار جاشہ میں آپ کو بھیجا وہاں بھی اچھا نفع حاصل ہوا۔ آپ وہاں سے کپڑے خریدتے لائے جس کی تجارت سے مکہ میں بہت فائدہ ہوا۔ یہ سفر بھی آپ کا بہت کامیاب ہوا۔

حضرت خدیجہ آپ کے حسن معاملت اور دیانت داری سے بے حد خوش ہوئیں۔ اس کے علاوہ چونکہ نسطورا راہب وغیرہ کا قصہ سن چکی تھیں اس لئے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ آں حضرت کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں اور یہی وجہ تھی جس نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی ترغیب دلائی۔

نفیسہ جو حضرت خدیجہ کی لونڈیوں میں تھیں کہتی ہیں کہ خدیجہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے بہت قدر تھی اور ان کے اخلاق اور راستی پر وہ فدا تھیں۔ جب حضرت دوسری بار یمن کے بازار سے واپس آئے تو خدیجہ نے مجھکو بطور پیغامبر کے آپکے پاس بھیجا میں نے جا کر عرض کیا کہ آپ نکاح کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ میرے پاس اس وقت نہ کچھ مال ہے نہ سامان۔ نکاح کیوں کر کروں۔ میں نے کہا کہ اس کی ذمہ دار میں ہوں اور ایسی جگہ نکاح کراؤں گی جہاں مال، جمال، شرافت اور اطاعت سب کچھ ہو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ میں نے کہا خدیجہ

فرمایا کہ کیونکر سرانجام ہوگا۔ میں نے کہا سب کچھ میں کرلوں گی۔ یہ کیفیت میں نے آکر خدیجہ سے بیان کی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا کہ مجکو آپ کی طرف صرف اس لئے رغبت ہے کہ آپ کی کوئی بات کبھی میں نے جھوٹی نہیں پائی، اور آپ کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ آپ اپنے چچا ابوطالب کے پاس گئے، اُن سے یہ حال بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے۔ خدیجہؓ نے بھی اپنے چچا عمرو بن اسد اور تمام قبیلے کو جمع کیا۔ ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا حضرت حمزہ نے ۲۰ اونٹ مہر میں دئے اور نکاح ہوگیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال۔

اس نکاح کے بعد چونکہ آپ کو دولت مل گئی اس وجہ سے آپ کی عزت اور وقعت بڑھ گئی۔ اور دنیوی اسباب کے لحاظ سے رسالت کی کامیابی کی شاہراہ اسی وقت سے کھل گئی۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کو فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ اپنے اس کام کے لئے کوشش کرنے کا موقع مل گیا جس کے لئے مشیت ایزدی نے دنیا میں آپ کو بھیجا تھا۔ اکثر غار حرا میں چلے جاتے اور وہیں عبادت کیا کرتے۔ حضرت خدیجہ ہر ایک کام میں آپ کی مرضی کے مطابق مدد کرنے کے لئے تیار رہتیں۔ جس وقت چالیس سال سے آپ کا سن شریف متجاوز ہوا اس

وقت رسالت عطا ہوئی۔

غارِ حرا میں آپ خدا کی زبردست نشانی (روح الامین) کو دیکھ کے ڈر گئے۔ کلپتے ہوئے گھر میں آئے اور کہا۔ زملونی۔ زملونی (مجکو چادر اُڑھاؤ) پھر جب آپ کی طبیعت کو کچھ سکون ہوا تو حضرت خدیجہ سے تمام کیفیت بیان فرمائی۔ حضرت خدیجہ نے ہر طرح پر تسکین دلائی اور کہا تم صدقہ دیتے ہو، قرابت مندوں کے ساتھ سلوک کرتے ہو۔ تمہارا شیوہ احسان ہے۔ تم اللہ سے ڈرتے ہو۔ کیا تم کو اللہ ضائع کرے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ پھر آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ اُن سے سارا حال بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ علامت تمہاری نبوت کی ہے۔ تمھیں اللہ تعالیٰ سرفراز کرے گا۔ اور تمہاری قوم تم کو یہاں سے نکال دے گی۔ آپ نے تعجب سے فرمایا کہ کیا مکے سے لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ جس قدر نبی گذرے ہیں سب کے ساتھ اُن کی قوم نے ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ تم کو لوگ ضرور نکالیں گے۔ کاش اس وقت تک میں زندہ رہتا تو تمہارا ساتھ دیتا۔

ورقہ بن نوفل کا یہ کلام سن کر اور خدیجہ رض کی باتوں سے آپ کو تسکین ہوگئی اور جب کبھی کسی قسم کی گھبراہٹ آپ کی طبیعت کو ہوتی تو حضرت خدیجہ رض

ہی تسکین دلائیں اور ہمت بندھائیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجکو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو خدیجہؓ سے کہتا تھا وہ اس طرح سمجھاتی تھیں کہ اس سے میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج مجکو نہیں ہوتا تھا کہ خدیجہؓ کی باتوں سے وہ ہلکا اور آسان نہ ہو جائے" اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ثابت القلب اور مستقل مزاج تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم اور بھاری بھرکم رسول کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھایا کرتی تھیں۔ اس طرح پر وہ آنحضرت کی نہ صرف زندگی کی شریک تھیں بلکہ رسالت کی کامیابی میں بھی ایک قوی اور زبردست بازو تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات کے بعد اکثر ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اکثر جب آپ گھر میں تشریف لاتے تو خدیجہؓ کا ذکر کرتے اور بے حد ان کی تعریف فرماتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ خدیجہؓ سے اچھی کوئی بیوی مجکو نہیں ملی۔ وہ ایمان لائی اور سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی۔ اور سب لوگ مجکو جھٹلاتے تھے۔ اس نے اپنے مال سے میری مدد کی اور سب لوگوں نے مجکو محروم رکھا۔ اس سے اللہ نے مجھے اولادیں عطا کیں اور کسی بیوی سے اولاد نہ ہوئی

جس طرح حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان و دل سے مددگار مطیع اور فرماں بردار تھیں۔ اسی طرح حضرت بھی اُن کی قدر کرتے تھے اپنے تمام معاملات میں اُن سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے سے کام کرتے، اسی وجہ سے اُن کی وفات سے آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ کیونکہ اُن سے ہر طرح کا آپ کو آرام و اطمینان حاصل تھا۔ اُن کی صائب رائے اور تدابیر کی وجہ سے کفار مکہ آپ کو زیادہ تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے اُن کے انتقال کے بعد ہی ابو طالب بھی مر گئے۔ اور چاروں طرف سے کفار نے سر اُٹھایا، اور ستانا شروع کیا۔

حضرت خدیجہ رضؓ نے ۶۵ برس کی عمر میں ہجرت سے تین سال پیشتر رمضان کے مہینے میں وفات پائی اور مکے کے مشہور قبرستان حجون میں دفن کی گئیں۔ اس وقت جنازہ کی نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولادیں سوائے حضرت ابراہیم کے انھیں سے تھیں۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے جو چار برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انھیں کے نام سے آپ کی کنیت ابوالقاسم ہوئی پھر زینب۔ اس کے بعد عبداللہ۔ پھر رقیہ۔ پھر ام کلثوم۔ پھر فاطمہ زہرا عبداللہ نے بھی جن کا لقب طیب و طاہر تھا دو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حضرت خدیجہ ان بچوں کی پرورش اور تربیت نہایت محبت اور پیار کے ساتھ کرتی تھیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ "کانت ربۃ البیت وام العیال" (گھر کی مالک اور بچوں کی ماں تھی)، رحمہا اللہ ورضی عنہا۔

ان کی فضیلتیں حدیثوں میں بہت کثرت سے ہیں۔ بخاری میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر اس امت کی عورتوں میں خدیجہؓ ہیں اور گذشتہ اُمت میں مریمؑ۔

بے شک اسلام کی جڑ جمانے کی ابتدائی کوششیں، تن، من دھن سے رسالت کی مدد اور اولیت اسلام یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو ہر طرح پر حضرت خدیجہؓ کو اس اُمت کی تمام عورتوں سے بہتر ہونے کا درجہ دیتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں وجوہات سے فرمایا تھا کہ خدیجہ اللہ تعالیٰ تم کو بشارت بھیجتا ہے کہ تمھارے لئے جنت میں ایک محل تیار ہے۔

ان کی وفات کے بعد آں حضرت ہمیشہ اُن کی تعریف اور اُن کے لئے دعا فرماتے، اور جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے اُن کی سہیلیوں کو گوشت بھیج دیتے، اس کے بعد کسی کو دیتے۔ اُن کا کوئی رشتہ دار

جب آپ کے پاس آتا تو بہت زیادہ آپ اُس کی خاطر مدارت کرتے
جب تک خدیجہؓ حضرت کے نکاح میں تھیں اس وقت تک آپ
نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔

حضرت فاطمہؓ

نام فاطمہؓ۔ لقب زہرا ہے۔ نسب کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ
دنیا میں سب سے بڑے باپ کی بیٹی ہیں جس پر تمام مکارم، فضائل
انسانی شرافت اور خوبیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی والدہ خدیجۃ الکبریٰ
ہیں جنھوں نے سب سے پہلے رسالت کی تصدیق کی اور جن کے فضائل
اس قدر ہیں کہ اس اُمت میں اُن کا وہی درجہ ہے جو گذشتہ اُمت میں
حضرت مریمؑ کا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سات اولادیں ہوئیں جن میں
سے آپ کے صرف ایک بیٹے ابراہیم ماریہ قبطیہ سے تھے۔ اور باقی کل حضرت
خدیجۃ الکبریٰؓ سے تھیں۔ لیکن کسی سے سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے

بسل نہیں چلی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے تمام حقیقی بھائی بہنوں سے چھوٹی ہیں ان کی ولادت مکے میں ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک ۳۵ سال کا تھا۔

بچپن ہی سے حضرت فاطمہؓ کی طبیعت میں بہت زیادہ متانت اور سادگی تھی، اُن کی اور بہنیں کھیلنے لگتیں، لیکن ان کا جی کھیل میں نہ لگتا۔ وہ اکثر اپنے قبیلے کے اور گھروں میں چلی جاتیں، لیکن یہ کہیں جانا پسند نہ کرتیں ہمیشہ اپنی محترم والدہ کے پاس ہی رہتیں۔ ان کی یہ سادگی متانت اور استغنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد پسند تھی، اس لئے آپ ان کو بتول (تارک الدنیا) کہا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ جس قدر آپ کو محبت تھی اسی اور کسی اولاد کے ساتھ نہ تھی حالانکہ ان کی بعض بڑی بہنیں اُن سے زیادہ خوب صورت اور تیز فہم تھیں۔

ابھی اُن کی عمر پورے پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ محترم والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اسی سال قضاء الٰہی سے ابو طالب نے بھی انتقال کیا جو حضرت علیؓ کے باپ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور زبردست حامی تھے۔ ان دونوں واقعات سے آں حضرت کو اس قدر رنج ہوا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ ہم کو خوف تھا کہ آپ کی حالت غیر نہ ہو جائے ایسی حالت میں حضرت فاطمہؓ کے رنج و غم کا اندازہ لگانا ایک مشکل امر ہے

۵۸

اِدھر ماں کی وفات کا صدمہ، ادھر باپ کی پریشانی علاوہ بریں ابوطالب کے مرنے سے کفار مکہ حضرت کو ستانے لگے تھے اس کا رنج غرض ایک مصیبت کا پہاڑ تھا جو اُن کے اوپر ٹوٹ پڑا تھا۔ باوجود ایسے سخت روحانی آلام کے انھوں نے نہایت صبر و استقلال سے کام لیا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہتیں کہ کسی طرح اپنے معزز باپ کو خوش دیکھیں اور ہمیشہ اسی ٹوہ میں لگی رہتیں کہ ایسا نہ ہو کہ کفار کہیں ان کو کوئی تکلیف پہنچائیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عتبہ اور شیبہ وغیرہ نے جو کفار کے سرگروہ تھے اور حضرت کو تکلیف پہنچانے کی کوشش میں رہا کرتے تھے۔ اونٹ کا پوٹا جو اسی دن ذبح کیا گیا تھا سجدے کی حالت میں آپ کی گردن پر لا کر ڈال دیا۔ آپ اس کے بوجھ سے سر نہ اُٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر فاطمہؓ دوڑیں اور اس کو آپ کی گردن پر سے ہٹا دیا۔ اور ان کفار کو جو وہاں کھڑے ہنس رہے تھے بددعائیں دیں۔ حضرت نے بھی اُٹھ کر بددعا فرمائی۔ اور آخر بدر کی لڑائی میں وہ سب کے سب واصل جہنم ہوئے۔

حضرت فاطمہ ہمیشہ سے اپنے تمام انداز، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے بول چال، لباس وغیرہ۔ غرض ہر ایک بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تقلید کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "میں نے

تمام حرکات و سکنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ فاطمہ رض ہی کو پایا۔ ام سلمہ رض کہتی ہیں کہ "رفتار و گفتار میں بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاطمہ ہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے آنحضرت اُن سے بہت زیادہ الفت رکھتے تھے۔ جب کبھی کسی سفر یا لڑائی سے واپس آتے تو مسجد میں دوگانہ ادا کر کے سب سے پہلے حضرت فاطمہ رض کو دیکھنے جاتے اس کے بعد ازواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے۔ اور ان کی اس قدر وقعت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور ان کو اپنے پاس بٹھاتے۔ اور ان کی سر آنکھوں پر بوسہ دیتے۔ ویسا ہی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر جاتے تو وہ کرتیں۔

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے اس وقت حضرت فاطمہ کنواری تھیں بعض لوگوں نے نکاح کا پیغام دیا سرور کائنات خاموش رہے۔ پھر انصار نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو آمادہ کیا کہ تم خود جا کر آں حضرت سے اپنے متعلق کہو۔ حضرت علی تشریف لے گئے نکاح کا پیغام دیا۔ آپ خوش ہوئے اور فاطمہ رض سے جا کر فرمایا کہ علی رض تمہاری نسبت عرض کرتے تھے وہ خاموش ہو گئیں۔ حضور نے اُن کے سکوت کو رضامندی قرار دے کر حضرت علی رض کے ساتھ اُن کا نکاح کر دیا۔ یہ نکاح ہجرت سے پانچ مہینے بعد ہوا۔ اس وقت حضرت فاطمہ رض کی عمر ۱۸ سال ۶ مہینے کی تھی۔ اور

حضرت علیؓ کا سِن ۲۱ برس ۵ مہینے کا تھا۔

حضرت علیؓ اس وقت بہت تنگدست تھے۔ اور کچھ پاس نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو ایک زرہ دی تھی وہ کہاں ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو موجود ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ اسی کو فروخت کر دو۔ حضرت علیؓ وہ زرہ بیچنے کو لے گئے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس کو چارسو درہم پر خرید لیا اور جب پہنا تو کہا کہ اے علیؓ! یہ زرہ بہ نسبت میرے جسم کے تمھارے جسم پر زیادہ زیب دیتی ہے۔ اس لئے میں قیمت دینے کے بعد یہ زرہ بھی تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ وہ زرہ اور چارسو درہم لائے وہی چارسو درہم حضرت فاطمہؓ کا مہر قرار پایا۔

نکاح کے بعد حضرت نے ایک طشت خرما منگایا اور اپنے اصحاب میں لٹا دیا۔ بعد ازاں حضرت سعدؓ نے ایک مینڈھا لا کر دیا اور حضرت علیؓ اپنی زرہ گرو رکھ کر ایک یہودی کی دکان سے تھوڑا سا جو لائے جس سے ولیمہ کا سامان کیا گیا۔

حضرت علیؓ نے ایک چھوٹا سا مکان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے کسی قدر فاصلے پر تھا کرایے پر لیا۔ آپ نے اپنی لونڈی اُمّ ایمنؓ کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت کر دیا۔

اس دین و دنیا کے بادشاہ کی معزز بیٹی نہایت سادگی کے ساتھ ایک

لونڈی کے ہمراہ پاؤں پیدل اپنے شوہر کے گھر میں آکر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ عروسانہ لباس یہ تھا۔ زیوروں میں صرف بازوبند اور کپڑوں میں چادر زعفرانی رنگی ہوئی اور بس۔

جہیز میں ایک چادر۔ ایک چمڑے کا گدا جس میں گھاس بھری ہوئی تھی۔ ایک تکیہ آٹا پیسنے کی چکی ۔ ایک مشکیزہ اور دو ڈول تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مکان دور واقع ہونے سے تکلیف تھی۔ کیونکہ اکثر اُن کے دیکھنے کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ میں اپنے گھر کے قریب تم کو رکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ آپ کے قرب وجوار میں حارثہؓ کے بہت سے مکانات ہیں۔ اگر آپ اُن سے فرمائیں گے تو وہ کوئی مکان ہمارے لیے خالی کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ حارثہؓ تو میرے لیے اس قدر مکانات خالی کر چکے ہیں کہ اب مجھے کہتے ہوئے اُن سے شرم معلوم ہوتی ہے۔

یہ خبر حارثہؓ کو بھی پہنچی۔ وہ حضور کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یارسول اللہ میں نے سُنا ہے کہ آپ فاطمہؓ کو اپنے قریب بلانا چاہتے ہیں اس لئے میں یہ مکان جو آپ کے متصل ہے خالی کئے دیتا ہوں۔ یارسول اللہ قسم ہے اللہ کی کہ میں اور میرا مال سب اللہ اور اُس کے رسول کے لئے

ہیں۔ میرا وہ مال جو آپ کے کام آئے مجھے زیادہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس مال کے جو میرے کام آئے۔ چنانچہ وہ مکان انھوں نے خالی کر دیا اور حضرت فاطمہؓ اس میں آگئیں۔

حضرت فاطمہؓ نہایت متقی اور دیندار عورت تھیں۔ تکلیف دنیا اور مصائب کا ان کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے گھر کا تمام کام کاج پیسنا، پکانا خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب آٹا گوندھتے گوندھتے ان کا ہاتھ گھس گیا تھا اور چکی پیستے پیستے گٹھے پڑ گئے تھے تو حضرت علی کے کہنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں تاکہ اُن سے ایک خادمہ مانگیں۔ اس وقت حضرت کے پاس بہت سی لونڈیاں آئی ہوئی تھیں۔ جب وہاں گئیں تو حضرت نے نہایت پیار سے بٹھایا اور باتیں کرنے لگے۔ حضرت فاطمہؓ کو لونڈی مانگتے ہوئے شرم آئی۔ تھوڑی دیر بیٹھیں۔ اس کے بعد واپس چلی آئیں اور کچھ نہ کہا۔ پھر حضرت علیؓ خود اُن کو ساتھ لے کر گئے اور عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان لونڈیوں میں سے میں تم کو نہیں دے سکتا یہ اہلِ صُفّہ کا حق ہیں۔ یہ دونوں ناکامیاب وہاں سے واپس چلے آئے رات کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا میں تم کو ایک ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمھارے لئے خادمہ سے بہتر ہو۔ کہا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم سونے لگو

تو سبحان اللہ ۳۳ - الحمد للہ ۳۳ اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو۔
اس واقعہ کو مولانا شبلی صاحب نعمانی نے نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اَٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح شام تھا
آخر گئیں جناب رسولِ خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے
کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا

غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں
حیدر نے اُن کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صُفّۂ نبوی میں قیام تھا
میں اُن کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہرچند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب اُن پر گزرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں، میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم تھا ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی ہے اہل بیت مطہّر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

حضرت علی کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ حضرت فاطمہ اُن کے نکاح میں تھیں صحابہ کرام اس کی وجہ سے اُن کا بہت احترام

کرتے تھے۔

باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ جناب سیدہ کی خاطرداری کا خود بہت خیال رکھتے تھے اور کوئی بات ان کی منشا کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تاکید فرماتے تھے کہ فاطمہ رضؓ کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو۔ ادھر حضرت فاطمہ رضؓ کو بھی بار بار نصیحت کرتے رہتے تھے کہ عورت کا بڑا فرض شوہر کی اطاعت ہے۔

ایک مرتبہ کسی بات پر حضرت فاطمہ حضرت علیؓ سے رنجیدہ ہوگئیں، اور کہا کہ میں اس کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کروں گی۔ چنانچہ وہاں تشریف لے گئیں اور کیفیت بیان کی۔ حضرت علی بھی ساتھ ساتھ گئے۔ اور خاموش بیٹھے تھے۔ حضور رسالت مآب نے جناب سیدہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "بیٹی سنو، سوچو، سمجھو، یہ کیا ضرور ہے کہ مرد تمام کام عورت کی منشار کے مطابق ہی کرے"

یہ نصیحت سن کر آپ وہاں سے واپس آئیں۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ اس کا میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں نے اپنے دل میں عہد کرلیا کہ اب کبھی فاطمہ رضؓ کے خلاف مزاج کوئی کام نہ کروں گا۔

ایک مرتبہ سرور کائنات کسی سفر سے تشریف لائے۔ اور جب

معمول پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے۔ اُن کے یہاں ایک رنگین پردہ لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں انھوں نے دو چاندی کے کنگن پہن رکھے تھے آپ یہ دیکھتے ہی واپس چلے آئے۔ حضرت فاطمہ آپ کے اس طرح واپس چلے آنے سے رونے لگیں۔ اتنے میں آپ کے غلام حضرت ابورافع وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو روتے ہوئے دیکھ کر کیفیت پوچھی۔ انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے مکان پر تشریف لائے تھے اور کبیدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ نہ معلوم کیوں۔

ابورافع نے کہا کہ اس کنگن اور پردہ کو دیکھ کر حضرت فاطمہ نے اسی وقت ان دونوں چیزوں کو حضرت بلال کے ہاتھ حضور کی خدمت میں بھیج دیا اور کہلا دیا کہ میں نے ان کو صدقہ کر دیا۔ آپ جس کو چاہیں دے دیں۔ آپ نے ان کو بیچ کر اُن کی قیمت اصحاب صفہ کے اخراجات میں صرف کر دی۔

حضرت علیؓ نے جب تک حضرت فاطمہ اُن کے نکاح میں رہیں دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ایک بار ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ معلوم ہوا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مشرک اور رسول اللہ کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں اس لئے

حضرت علی باز رہے۔

حضرت فاطمہ کی اور تین بہنیں جس طرح عین جوانی کے زمانے میں گذر گئیں اسی طرح حضرت فاطمہ نے بھی کم عمر پائی۔ ۲۹ سال اور چند مہینے کی عمر میں رسول اللہ کی وفات کے چھ مہینے کے بعد تیسری رمضان ۱۱ھ سہ شنبہ کی رات کو انتقال فرمایا۔

یہی سبب ہے کہ ان سے حدیثیں بہت کم روایت کی گئی ہیں۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ فاطمہ آئیں۔ اور کس قدر اُن کی رفتار رسول اللہ سے مشابہ تھی۔ آپ نے ان کو نہایت پیار سے بٹھایا۔ اور کچھ اُن کے کان میں کہا وہ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ کچھ اُن کے کان میں کہا وہ ہنسنے لگیں مجھکو اُن کا رونا اور فوراً ہی ہنسنا دیکھکر سخت تعجب ہوا۔ جب وہاں سے اُٹھیں تو میں نے پوچھا۔ کہا کہ رسول اللہ کا راز ہرگز نہیں افشا کروں گی۔ میں خاموش ہو رہی۔ آن حضرت کے انتقال کے بعد میں نے پھر دریافت کیا۔ کہا کہ پہلے حضرت نے میرے کان میں کہا کہ یہ میری زندگی کا آخری سال ہے، اس پر میں رونے لگی پھر آپ نے فرمایا کہ تم اس سے خوش نہیں ہو کہ سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ۔ تو خوش ہو گئی۔

اُن کے مرض الموت کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل خاموش

ہیں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا وہ کسی ایسے سخت مرض میں نہیں مریں جس کی وجہ سے کچھ دنوں تک صاحبِ فراش رہی ہوں بلکہ ابن عبدالبر لکھتا ہے کہ جس دن ان کا انتقال ہوا اسی دن انھوں نے اچھی طرح غسل کیا تھا اور کپڑے بدلے تھے۔

جنازے میں بہت کم لوگوں کو شرکت کا موقع ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کو انتقال ہوا، اور حضرت علی کو وصیت کر گئی تھیں کہ رات ہی کو مجکو دفن کر دینا۔ انھوں نے خود ہی غسل دیا۔ حضرت عباسؓ نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ قبر کا ٹھیک پتہ نہیں۔ مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ مدینے میں جنت البقیع کے قریب ہی کہیں ہے۔

ان سے چار اولادیں تھیں۔ حسنؓ۔ حسینؓ۔ زینبؓ۔ ام کلثومؓ

ام کلثومؓ سے عمر بن الخطابؓ نے نکاح کیا۔ ان سے دو ہی ایک نسل چل کر ختم ہو گئی۔ باقی اور اولاد کی نسل دنیا کے ہر حصے میں ہے

حضرت فاطمہ کی فضیلتیں بہت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ فاطمہ میری ریحانہ ہے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میری آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فاطمہ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک مرتبہ کسی نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سب سے زیادہ کس کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا فاطمہؓ کے ساتھ۔

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حضرت فاطمہ رض جنتی عورتوں کی ملکہ ہیں۔ صحابہ نے ایک مرتبہ پوچھا کہ یا رسول اللہ عورتوں میں کس کا درجہ بلند ہے۔ آپ نے چار خط زمین پر کھینچے اور فرمایا مریم، خدیجہ، فاطمہ اور آسیہ (زوجہ فرعون)۔

اس امر میں محدثین کا اختلاف ہے کہ اس امت میں افضلیت کس کو ہے۔ کسی نے حضرت عائشہ کو افضل قرار دیا ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت فاطمہ سب سے بہتر ہیں۔

لیکن مسلمانوں کا اعتقاد یہی ہے کہ حضرت فاطمہ افضل ہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

دی کسے گفت عائشہ درفضل | بہتر از بنت سید البشر است
مصرعے درجواب او گفتم | رشتہ دیگر رگ جگر دگر است

پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ خدیجہ رض بہتر ہیں کہ عائشہ رض لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ حیثیتیں مختلف ہیں۔ اولیت اسلام اور ابتدائی کوششوں کے لحاظ سے حضرت خدیجہ افضل ہیں اور علم و عظمت کو دیکھتے ہوئے حضرت عائشہ کا درجہ بلند ہے

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ فاطمہؓ کی فضیلتیں اس وجہ سے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ اُن کی ذاتی خوبیوں نے اُن کے درجے بلند کئے ہیں۔ اسلام میں نسبی شرافت کا لحاظ نہیں ہے بلکہ پرہیزگاری کا ہے۔ حضرت نے ایک مرتبہ فاطمہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم یہ خیال نہ کرو کہ میں تمھارا باپ ہوں تو آخرت میں تمھاری مدد کروں گا۔ میں بلا اذن کسی کی شفاعت نہیں کرسکتا، تم عمل کرو، اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھو اور یہ سمجھ لو کہ عاقبت میں کوئی چیز سوائے عمل خیر کے مفید نہیں ہو سکتی۔

اُم المومنین عائشہؓ

دنیا کی تاریخ میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے آدمی تسلیم کئے جاتے ہیں، اسی طرح عائشہؓ تاریخی لحاظ سے سب سے بڑی عورت ہیں اور جس طرح اُن کے محترم شوہر نے دنیا میں ایک سچا مذہب پھیلا کر بہت بڑا احسان کیا ہے اُسی طرح عائشہؓ نے اُن کی تعلیمات شائع کرکے اُمت کو مرہونِ منت کیا ہے۔ چنانچہ بعض محدثین کا قول ہے کہ اگر

حضرت عائشہؓ نہ ہوتیں تو نصف علم حدیث ضائع ہو جاتا۔ اُن کی عقل مندی، صداقت، ذہانت، صورت، سیرت، نیکی اور بہت سے اوصاف اسی قابل تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی بہترین بیوی شمار کرتے۔

اُن کے باپ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ اول ہیں جو انبیاء کے بعد بلا استثنا تمام دنیا کے آدمیوں سے بہتر ہیں۔ اُن کی والدہ ام رومان ہیں جو کنانہ کی اولاد میں سے ہیں۔ باپ کی طرف سے قریشی اور ماں کی جانب سے کنانی ہیں۔

ان کی ولادت ہجرت سے نو سال پیشتر مکّے میں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ اس سے کئی سال پیشتر سے مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لئے ان پر ایک لمحہ بھی کفر کا زمانہ نہیں گزرا۔ اور دنیا میں آتے ہی اپنی پرورش کے لئے ان کو اسلامی آغوش ملا۔ بچپن میں اُن کی نہایت اچھی پرورش ہوئی، کیونکہ ان کا حُسن اور اُن کی طبیعت کی تیزی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ماں باپ ان کی غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں اور اُن کا جسم بہت توانا تھا۔ اس لیے اُن کی نشو ونما بہت اچھی ہوئی اور اپنی ہم جنسوں میں قد و قامت صورت اور ذہانت کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہیں۔ قبیلے کی تمام لڑکیاں

انھیں کے پاس جمع ہوتیں۔ گڈے گڈیاں وغیرہ کھیلتیں چونکہ ذہین لڑکے لڑکیاں عام طور پر کھیل کے بہت شائق ہوتے ہیں، اس لئے یہ شوق اُن کے اندر بھی بہت تھا اور اس وقت کے معمولی کھیلوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اپنے پاس جمع رکھتی تھیں۔ اور اس طرح پر تمام لڑکیوں کی سردار بنی رہتی تھیں۔ ماں باپ کو اُن کی ہر ایک عادت بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی، اور وہ اپنی اس ہونہار بچی کی ہر ایک ادا کو بڑے پیار سے دیکھتے تھے۔ اور ان کی بلند خیالی اور عالی ہمتی دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ یہ ضرور ایک معزز اور ممتاز لڑکی ہوگی۔

خاص کر اُن کے اس خواب سے جو اُنھوں نے دیکھا کہ تین چاند ٹوٹ کر میرے آغوش میں گرے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جو خواب کی تعبیر کرنے میں تمام عرب میں مشہور تھے اور بھی متحیر تھے۔ چنانچہ آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور آپ حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے میں دفن کئے گئے تو ابوبکر رضؓ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ تمھارے تین چاندوں میں سے پہلا اور سب سے اچھا چاند تمھارے آغوش میں آیا۔ اور اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ بعد میں دو چاند (ابوبکر رضؓ۔ عمر رضؓ) اور بھی اسی آغوش میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔

جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بہت عرصے تک مغموم رہے۔ خولہؓ نے جو مشہور صحابی عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھیں، آپ کو رنج میں دیکھ کر کہا کہ یا رسول اللہ آپ کوئی نکاح کریں۔ آپ نے فرمایا کہاں؟ کہا اگر آپ چاہیں تو کنواری سے کریں، نہیں تو بیوہ ہے۔ آپ نے پوچھا بیوہ کون ہے اور کنواری کون ہے؟ کہا کنواری تو عائشہؓ ہے جو اس شخص کی لڑکی ہے جو آپ کے نزدیک اس وقت اللہ کی تمام مخلوق سے پیارا ہے۔ اور بیوہ سودہ بنت زمعہ ہے جو آپ پر ایمان لائی ہے۔ اور آپ کی رسالت اور احکام کو مانتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں سے کہو۔ یہ سُن کر خولہ خوشی خوشی ابوبکرؓ کے گھر آئیں۔ اور آنحضرت کا پیغام کہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت خوشی کے ساتھ نکاح کر دیا۔ ایک مکان جس کی قیمت کم و بیش پچاس دینار تھی اُن کا مہر قرار پایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری آپ کے نکاح میں آئیں۔ ورنہ اور جتنی بیبیاں تھیں کوئی ایک نکاح کے بعد آپ کے نکاح میں آئی تھی، اور کوئی دو نکاح کے بعد۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اس کے ایک سال کے بعد حضرت عائشہؓ وداع کی

گئیں، اُس وقت اُن کی عمر کچھ زائد نو سال تھی، اور جب سرورِ عالم کی وفات ہوئی تو وہ چند ماہ زائد اٹھارہ سال کی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امہات المومنین کی بہ نسبت اُن کے ساتھ زیادہ محبت اور انسیت تھی اور ان کی بہت قدر اور عزت کرتے تھے لیکن باوجود اس کے حقوق آپ نے سب کے ایک سال مقرر کر رکھے تھے۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ البتہ حضرت سودہؓ نے اپنے تمام حقوق حضرت عائشہؓ کو دے دئے تھے اس لئے دیگر ازواج مطہرات کی بہ نسبت اُن کا حق دو چند تھا۔

حضور اکرم کو حضرت عائشہؓ کے ساتھ جو محبت تھی وہ اُن کے عمدہ اوصاف اور عقل مندی کی وجہ سے تھی۔ اکثر جب آپ گھر میں تشریف لاتے تو اُنھیں سے گفتگو فرماتے۔ اور اُن کی باتیں سنتے۔ حضرت عائشہؓ کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی۔ نہایت مسلسل اور معقول گفتگو کرتی تھیں۔ اس وجہ سے آپ اُن کی باتوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر حضرت عائشہؓ کے ساتھ محبت تھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ یہ ان پر قربان تھیں اور بحیثیت شوہر ہونے کے تو عزت کرتی ہی تھیں۔ رسالت کے آداب کا بھی ساتھ

ہی ساتھ لحاظ رکھتی تھیں۔ اور کبھی اپنے مرتبے سے تجاوز نہیں کرتی تھیں جس امر کو ذرا بھی حضور کے خلاف طبع دیکھتیں، کبھی اس کی جرأت نہ کرتیں اور آپ کے تمام حالات سے خواہ گھر کے ہوں یا باہر کے واقفیت حاصل کرتیں اور اُن کو محفوظ رکھتیں۔ اُن سے دو ہزار دو سو دس حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

جس قدر عورتیں دربار نبوت میں مسئلہ پوچھنے آتیں زیادہ تر حضرت عائشہ رضؓ ہی کے ذریعے سے پوچھتیں۔ اور یہ رسوخ جو حضور کی خدمت میں اُن کو حاصل تھا ان کی کمال ذہانت اور تقوے اور دینداری کی وجہ سے تھا۔ ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ جو بات اُن کی سمجھ میں نہ آتی، اس پر دوسروں کی طرح فوراً اعتقاد نہیں کر لیتی تھیں۔ بلکہ اچھی طرح سمجھ بوجھ کر تسلیم کرتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر دشوار مسئلوں میں صحابہ کرام انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے، اور یہ اس کی دشواری کو حل کر دیتی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ بلکہ خلفاء میراث وغیرہ کے مسئلے ان سے آکر پوچھتے تھے۔

ان کی رائے عام مسائل میں بہت بہتر سمجھی جاتی تھی جاہلیت کے واقعات۔ حالات اور قدیمی شعراء کے اشعار کے علاوہ علم حدیث کی

معلومات ان کو بہت زیادہ تھی اور قرن صحابہ میں سب سے بہتر جو چند علماء تھے ان میں ان کا شمار تھا۔

اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر۔ ابن عباس۔ ابو موسیٰ اشعری۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہم عظیم الشان صحابہ اُن سے اکثر حدیثیں سنتے اور ان کو روایت کرتے تھے۔

امام زہری جو فن حدیث کے امام ہیں، کہتے ہیں کہ "حضرت عائشہؓ سب سے بڑی عالمہ ہیں" اور حقیقت میں آنحضرت کی حدیث کا بہت بڑا حصہ ہم تک نہ پہنچ سکتا اگر حضرت عائشہؓ اس کو محفوظ نہ رکھتیں۔

اُن کی تقریر نہایت فصیح و بلیغ اور پر زور ہوتی تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں اُن کی کئی زبردست تقریریں مندرج ہیں جن سے ان کا کمال معلوم ہوتا ہے۔

اُن کے علم کی وجہ سے حضرت کے بعد خلافت کے زمانے میں اُن کی عزت اور عظمت ترقی کرتی چلی گئی۔ تمام صحابہ ان کا اعزاز بہ نسبت اور امہات المومنین کے زیادہ کرتے تھے۔

حضرت عائشہ کو دنیا کے مال و جاہ کی کوئی خواہش نہیں تھی ہزاروں درہم اُن کے پاس آتے تھے اور وہ اسی دن غربا میں تقسیم کر دیتی

تھیں۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ درہم اُن کے پاس آئے، اُنھوں نے فوراً تقسیم کر دئیے، اس دن روزہ رکھا تھا ایک خادمہ نے کہا کہ آپ نے ایک درہم بھی نہیں رکھا کہ گوشت منگاتے۔ کہا کہ اگر تم نے یاد دلایا ہوتا تو میں رکھ لیتی۔

عبداللہ بن زبیر رضؓ جو مکہ کے حاکم تھے اور بعد میں خلیفہ ہو گئے، ان کے بھانجے تھے وہ اکثر لونڈی غلام اور مال و اسباب اپنی اس محترم خالہ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ ایک بار کئی سو لونڈی اور غلام بھیجے اور مال بھی بھیجا۔ انھوں نے تمام مال خیرات کر دیا اور لونڈی اور غلام آزاد کر دئیے۔ عبداللہ رضؓ نے جب یہ کیفیت سُنی تو کہا کہ اب نہ بھیجیں گے وہ بہت بے دردی سے خرچ کر ڈالتی ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عائشہ رضؓ عبداللہ رضؓ سے خفا ہو گئیں اور فرمایا کہ اب سے وہ میرے سامنے نہ آنے پائے۔ آخر کئی دن کے بعد بڑی سفارش سے عبداللہ آئے۔ پاؤں پکڑ کے رونے لگے اور اپنے قصور کی معافی چاہی۔

ان کی سب سے بڑی فیاضی یہ تھی کہ ان کے حجرے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضؓ دفن ہو چکے تھے تو ایک قبر کی جگہ خالی تھی۔ حضرت عائشہ رضؓ نے اس کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا کسی مسلمان اور خاص کر حضرت عائشہ رضؓ کو اس سے بڑھ کر اور کیا تمنا

ہو سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور حضرت ابوبکر رضؓ کے قریب دفن ہوں۔ مگر جس وقت حضرت عمر رضؓ نے مرتے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضؓ کو بھیجا کہ اور کہلایا کہ آپ وہ جگہ جو اس حجرے میں خالی ہے مجکو دے دیں تاکہ میں اُسی میں دفن ہوں تو حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ میں نے تو اس کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا، مگر چونکہ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے اس لئے آپ کو اپنے پر ترجیح دیتی ہوں۔ اور آخر حضرت عمر رضؓ وہیں دفن ہوئے۔ یہ ایسی فیاضی ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

امام قاسم جو محمد بن ابوبکر رضؓ کے بیٹے ہیں بیان کرتے ہیں کہ جب مصر میں ہمارے والد کو لوگوں نے قتل کر ڈالا تو ہمارے چچا عبدالرحمن بن ابی بکر رضؓ مجکو اور میری بہن کو اپنے ہمراہ مدینے میں لائے تاکہ پرورش کریں حضرت عائشہ رضؓ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ آئیں اور ہم دونوں بھائی بہن کو اپنے گھر لے جاکر پرورش کرنا شروع کیا اور اس محبت اور شفقت سے پالا کہ کسی کے ماں باپ کیا ایسی پرورش کریں گے۔ جب ہم دونوں سن شعور کو پہنچ گئے تو انھوں نے ایک دن عبدالرحمن رضؓ کو بلایا اور کہا کہ میں دیکھتی ہوں کہ جب سے تمھارے گھر سے میں ان بچوں کو اُٹھا لائی ہوں تم مجھ سے کچھ خفا سے رہتے ہو، میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ میں ان

بچوں کو اس وجہ سے تمھارے گھر سے نہیں اُٹھالائی کہ میں نے تمھاری محبت میں کمی یا خبر گیری میں کوتاہی دیکھی بلکہ اس وجہ سے کہ تمھاری کئی بیویاں تھیں ممکن تھا کہ ان نا فہم بچوں کی پرورش میں کوئی امر ایسا پیش آتا جو ان میں سے کسی کو ناگوار خاطر ہوتا اس لئے میں نے اپنے آپ کو ان کی نگہداشت کے لئے زیادہ مستحق سمجھا۔ اب کہ یہ بچے سن تمیز کو پہنچ گئے اور بھلائی برائی میں امتیاز کرنے لگے۔ ان کو میں خوشی سے تمھارے حوالے کرتی ہوں اپنے ساتھ لے جاؤ اور ان کے لئے ایسے ہی بنو جیسا کہ حجیہ کندی اپنے بھتیجوں کے لئے تھا۔

حجیہ کا قصہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی معدان نامی تھا، وہ مرگیا اس کے کئی بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ حجیہ اپنی اولاد سے زیادہ ان کی خاطر کرتا، اور بہت زیادہ خیال رکھتا۔ اتفاقاً کوئی سفر پیش آیا جس میں مجبوراً اس کو گھر سے نکلنا پڑا۔ جاتے وقت ان بچوں کی خبر گیری کی بابت بہت کچھ اپنی بیوی زینب کو تاکید کر گیا، لیکن جب ایک مہینے کے بعد واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے بچے تو اچھی حالت میں ہیں لیکن معدان کے بچے خستہ اور لاغر ہیں، اس نے زینب سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو نے ان بچوں کو پیٹ بھر کھانا تک نہیں دیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ان کو اور اپنے بچوں کو برابر ہی کھلاتی رہی ہوں۔ لیکن یہ

دن بھر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے جس سے اُن کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ حجیہ نے تنہائی میں ان بچوں سے پوچھا تو وہ روئے اور کہا کہ ہم کو تمھارے جانے کے بعد پیٹ بھر کھانا کبھی نہیں نصیب ہوا۔ حجیہ زینب سے سخت ناراض ہوا، اور جب اُس کے اونٹوں کا گلہ آیا تو وہ تمام گلہ اُس نے معدان کے بچوں کو بخش دیا۔ زینب کو اس کا بڑا قلق ہوا۔ وہ بگڑ کر پردے میں بیٹھی۔ حجیہ نے کچھ پروانہ کی۔ بلکہ اور زینب کی ہجو میں اشعار کہے۔ زینب آخر اسی رنج میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدینے چلی اور اپنے آبائی دین عیسوی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئی۔ حجیہ بھی اس خبر کو سُن کر مدینے میں آیا۔ زبیرؓ کے پاس ٹھہرا اور اپنی بیوی کا حال بیان کر کے یہ چاہا کہ اُن کی سفارش سے وہ واپس مل جائے۔

اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے زبیرؓ سے کہا کہ تمھارے مہمان کی خبر مجکو ملی ہے۔ اگر تم نے اسے پناہ نہ دی ہوتی تو میں اس کی خبر لیتا۔ زبیرؓ نے یہ کیفیت حجیہ سے بیان کی وہ ڈرا اور زینب سے نا اُمید ہو کر مدینے سے بھاگ گیا۔

سو میں بھی ڈرتی تھی کہ کہیں حجیہ ہی جیسا معاملہ تم کو پیش نہ آجائے اس لئے میں بچوں کو اپنے پاس لائی۔ لیکن اب تم خوشی سے ان کو لے جاؤ۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ اُن کی تعریف اور شکر کرتے ہوئے ہم دونوں

کو اپنے گھر لائے۔

حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے لئے دس ہزار درہم سالانہ اور حضرت عائشہؓ کے لئے بارہ ہزار درہم سالانہ گذارہ مقرر کیونکہ وہ تمام امہات المومنین میں سب سے زیادہ معزز تھیں۔ لیکن انھوں نے اس زیادتی کو منظور نہیں فرمایا، اور کہا کہ آنحضرت نے ہم سب کو برابر رکھا۔ اب گذارہ بھی برابر ہی رہنا چاہیئے۔ میں زیادہ نہیں لے سکتی۔

اس واقعہ کو سنہ ۱۹۱۰ء میں میں نے منظوم کر دیا، جو یہ ہے ؛

حضرتِ عائشہؓ وہ شمع حریم نبوی
جن سے روشن ہے نہاں خانۂ اخبار رسول

مدح میں جن کی ہیں انگشت بلب اہل کمال
وصف میں جن کے ہیں حیرت زدہ اربابِ عقول

علم کا جن کے یہ عالم تھا کہ اصحابِ کبار
بیشتر قول سے اُن کے نہیں کرتے تھے عدول

جن کو خالق نے عطا کی تھی طلاقت بے مثل
جن کی باتیں تھیں کہ تھے باغِ فصاحت کے وہ پھول

جن کی پاکیزگیٔ نفس کا قرآں ہے گواہ
سورۂ نور کا دیکھو تو سہی شانِ نزول

جن کو صدیقہؓ دیا سرورِ عالم نے لقب
جن پہ رکھتے تھے سدا خاص عنایت مبذول

جن کا آغوش تھا بالینِ پیمبر دمِ نزع
جن کے حجرے میں ہوئے دفن رسولِ مقبول

جو ہیں دنیا میں بھی، اور جنت فردوس میں بھی
حرمِ فخرِ رسل ہوں گی بہ رغمِ جہول

اُن کو ملتا تھا وظیفہ جو گذارے کے لئے
جس پہ تھا عہدِ رسالت سے برابر معمول

خرچ کو اُن کے وہ کافی تو نہیں تھا لیکن
فقر سے تھیں نہ وہ دلگیر نہ فاقہ سے ملول

عہد میں اپنے جو فاروق نے دیکھا یہ حال
کر دیا اُن کے وظیفے میں اضافہ معقول

لے کے جب اس کو گئے حضرت صدیقہؓ کے پاس
بولیں میں کر نہیں سکتی ہوں اضافے کو قبول

جملہ ازواج کو حضرت نے مساوی رکھا
اب یہ تفریقِ مدارج ہے بہم اُن میں فضول

اپنی ہم چشموں سے کچھ بڑھ کے نہ لوں گی ہرگز
میں نہ توڑوں گی مساوات کا پاکیزہ اصول

اہلِ بیتِ نبوی پر ہو خدا کی رحمت
جن سے اُمت میں ہوئے ایسے فضائل منقول

باوجود کثیر آمدنی کے بھی مہینے میں کئی کئی دن ایسے آتے تھے کہ جن میں فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لئے نہیں رکھتی تھیں۔

پھٹے کپڑوں میں خود پیوند لگا کر پہنتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کہا کہ اب تو کپڑوں کی کمی نہیں ہے، آپ نئے کپڑے کیوں نہیں پہنتیں۔ فرمایا کہ آنحضرت کی وصیت ہے کہ جب تک پیوند نہ لگاؤ کپڑے کو مت چھوڑو۔ جو پیوند نہیں لگاتا اس کو نئے کپڑوں کا کیا لطف آتا ہے۔

وہ ہمیشہ موٹے اور کم قیمت کے کپڑے پہنتی تھیں۔ اور اُن کو زعفرانی یا ارغوانی رنگ میں رنگ لیتی تھیں۔ ہاتھوں میں سونے اور چاندی کی انگوٹھی بھی ڈال لیتی تھیں۔

باریک کپڑوں سے اُن کو نفرت تھی۔ اُن کی بھتیجی حفصہ ایک مرتبہ ان کے پاس باریک اوڑھنی اوڑھ کر آئیں جس سے نظر گذر جاتی تھی حضرت

عائشہ رضؓ نے خفا ہو کر اُسے کھینچ لیا۔ اور ایک موٹی اوڑھنی لاکر اوڑھا دی اور فرمایا کہ سورۂ نور میں اللہ تعالےٰ نے بڑی تاکید کی ہے کہ عورتیں اپنی زینت کو چھپائے رکھیں۔

ایک شخص نے پوستین تحفہ میں پیش کی۔ فرمایا کہ مجھے مرے ہوئے جانوروں کی کھال سے نفرت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس کو اچھی طرح پکار کر صاف کر لیا ہے، تب اسے قبول کیا اور پہنا۔

مدینے میں ایک نابینا تھے ان کا نام اسحاق تھا۔ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں مسئلے پوچھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ آپ ان سے پردہ کیا کرتی تھیں انھوں نے کہا کہ میں تو اندھا ہوں۔ آپ مجھ سے کیوں پردہ کرتی ہیں۔ فرمایا کہ میں تو اندھی نہیں ہوں۔

صائم الدہر تھیں، اور تلاوت قرآن ان کا شغل تھا۔ تلاوت کے وقت بعض آیتوں پر اُن کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

تقوے کا یہ عالم تھا کہ بیماری میں اکثر کہا کرتی تھیں کہ کاش میں کوئی درخت ہوتی۔ کاش میں درخت کی کوئی پتی ہوتی جس کا حساب کتاب نہ ہوتا۔

مرض الموت میں جب گرفتار ہوئیں تو حضرت ابن عباس رضؓ ان کی عیادت کو گئے بہت کچھ تسلّی آمیز باتیں کہیں اور اُن کے فضائل میں جو

احادیث ہیں وہ بیان کیں۔ دوسرے روز پھر جب انھوں نے آنے کی اجازت مانگی تو فرمایا کہ معاف رکھو اُن کی تعریفوں کی ضرورت نہیں ہے۔

سہ شنبہ کی رات کو عشاء کے وقت ۱۷ رمضان ۵۸ھ میں ۶۶ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور اسی شب کو جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ شاید اس قدر ہجوم مدینے میں کسی رات کو نہ ہوا ہوگا۔ تمام لوگ۔ بوڑھے۔ جوان۔ مرد و عورت اور بچّے سب جمع تھے۔ ہزارہا مشعلیں جل رہی تھیں۔ رات ہونے کی وجہ سے اور نیز اُن کی اس عظمت اور محبت کی کشش سے جو مدینے کی عورتوں کے دلوں میں تھی تمام عورتیں جمع تھیں اور ایک عجیب و غریب کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت عائشہ رضؓ کی فضیلتیں بہت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس طرح تمام کھانوں میں بہتر ثرید ہے۔ اسی طرح عورتوں میں بہتر عائشہ رضؓ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ نے پوچھا کہ جنت میں آپ کی کون کونسی بیبیاں ہوں گی، فرمایا کہ تم بھی انھیں میں سے ہو۔

حضرت عائشہ رضؓ کہا کرتی تھیں کہ مجھکو چند خصوصیتیں حاصل ہیں جو

ازواج مطہرات میں سے اور کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ اور ان خصوصیات پر میں فخر کرتی ہوں۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے میرے کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا۔

دوسری یہ ہے کہ میری برارت آسمان سے نازل ہوئی۔

تیسری یہ ہے کہ میں ہی صرف آپ کی وہ بی بی ہوں جس کے ماں باپ دونوں مہاجر ہیں۔

چوتھی یہ کہ میرے ہی حجرے میں جبکہ آپ کا سر مبارک میرے آغوش میں تھا آپ نے انتقال فرمایا۔

پانچویں یہ کہ آپ میرے ہی حجرے میں مدفون ہوئے۔



حضرت صفیہؓ

حضرت صفیہ رضؓ کے والد عبدالمطلب بن ہاشم ہیں اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہیں۔ اُن کی والدہ کا نام ہالہ بنت وہب ہے جو حضور اکرم کی خالہ تھیں۔ حضرت صفیہ حضور کے والد عبد اللہ کی علاتی اور حضرت حمزہ سید الشہداء کی حقیقی بہن ہیں۔

اُن کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔ جاہلیت کے زمانے میں اُن کا نکاح حارث بن حرب کے ساتھ ہوا تھا جو ابوسفیان کے بھائی تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد عوام بن خویلد کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک تو حضرت زبیر جن کو دربار نبوت سے حواری کا خطاب ملا اور جو ان دس صحابہ میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی خوش خبری دنیا ہی میں آگئی تھی۔

دوسرے سائب جو عبدالکعبہ بھی کہے جاتے تھے۔

حضرت صفیہ ہجرت سے پہلے اسلام لائیں۔ حضرت کی چھ پھوپھیوں میں یہی ایک ایسی ہیں جن کے اسلام لانے پر تمام مؤرخ متفق ہیں۔ باقی

بتّہ۔ امیمہ اور ام حکیم یہ تین مسلمان نہیں ہوئیں اور عاتکہ اور اروی کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ دونوں مکّے میں اسلام لائیں اور پھر وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ شریف آئیں۔ لیکن ابن اثیر اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ سوائے حضرت صفیہ کے آنحضرت کی کسی پھوپھی کو اسلام لانا نصیب نہ ہو سکا۔

مدینہ شریف آنے کے بعد ۳ھ میں جنگ احد کا دردناک واقعہ پیش آیا جو مسلمانوں کا سب سے بڑا امتحان تھا۔ اس جنگ میں اسلام کا بہترین سپاہی میدان جنگ میں شہید ہوا۔ یعنی سیّد الشہداء حضرت امیر حمزہؓ۔

ہندہ نے جس کا باپ عتبہ بدر کی لڑائی میں مارا گیا تھا اپنے انتقامی جوش کا اس طرح اظہار کیا کہ سید الشہداء کا مُثلہ کیا یعنی ناک اور کان وغیرہ کاٹ لیے۔ سینہ چاک کر ڈالا اور کچے کلیجے کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ لیکن نگل نہ سکی۔

میدان جنگ کی ادھر یہ کیفیت تھی ادھر عورتوں نے نیزے مار مار کر بھاگے ہوئے مسلمانوں کا منہ پھر میدان جنگ کی طرف پھیرا جب لڑائی کا خاتمہ ہو چکا تو وہ قلبی محبت اور خونی کشش جو بھائی بہنوں میں ہوتی ہے حضرت صفیہؓ کو کھینچ کر اس طرف لے چلی،

جدھر سینہ فگار بھائی پڑا ہوا تھا، جس کی شکل بگاڑی جا چکی تھی۔ آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ اور کلیجے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضور انورؐ نے دور سے دیکھا اسی وقت حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ دیکھو اپنی ماں کو منع کرو وہ اِدھر نہ آنے پائے۔ حضرت زبیرؓ دوڑے اور منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے اُس کو دیکھنے آئی ہوں۔ حضرت زبیرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں رونے اور نوحہ کرنے کے لئے نہیں آئی ہوں بلکہ دیکھوں گی، صبر کروں گی اور مغفرت مانگوں گی۔

زبیرؓ نے دربارِ نبوت میں آکر عرض کیا۔ حضور نے فرمایا خیر دیکھ لینے دو۔ تب وہ قریب گئیں۔ کیفیت دیکھ کر جی بیقرار ہو گیا۔ لیکن اسلامی صبر کا دامن پکڑ کر دعائے مغفرت مانگی۔ کفن کے لئے بیٹے کو دو چادریں حوالے کیں اور وہاں سے باچشمِ تر مدینے کی طرف روانہ ہوئیں۔

حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ وہ چادریں ہم نے لیں کہ ان میں حضرت حمزہؓ کو دفن کریں لیکن انہیں کے قریب ایک انصاری شہید تھا اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا جو حمزہؓ کے ساتھ۔ ہم نے مروت کے خلاف

سمجھا کہ ایک کو دو چادروں میں دفن کریں اور ایک کو بے کفن چھوڑیں اس لئے دونوں کو ایک ایک چادر میں لپیٹ کر دفن کیا۔

۵ھ میں شوال کے مہینے میں پھر مکّے کے کافروں نے یہ ارادہ کیا کہ اب کے ایسی فوج لے چلو کہ مسلمانوں کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ انھوں نے ہزاروں روپے آس پاس کے قبائل میں تقسیم کئے تاکہ وہ اسلحہ خریدیں۔ سواری کے لیے اُن کو اونٹ دئے۔ اور تقریباً دس ہزار کی جمعیّت لے کر اسلام کو مٹانے کے لئے مدینے کو روانہ ہوئے۔

مشکل یہ تھی کہ مدینے کے قرب و جوار میں جو یہودی تھے وہ بھی باوجود اس کے کہ مسلمانوں سے عہد و پیماں کر چکے تھے۔ مکّے کے کافروں کے ساتھ شریک ہو گئے اور انھوں نے بھی یہی چاہا کہ لاؤ متفق ہو کر اس وقت اسلام کو مٹا ڈالیں۔

مسلمانوں کی کل لڑنے والی جماعت تین ہزار سے زیادہ نہ تھی حضور اکرمؐ نے جب کافروں کے یلغار کی خبر سُنی تو اسی قلیل جماعت کو لے کر مدینے سے باہر نکلے اور حضرت سلمان فارسی رضؓ کی رائے کے مطابق حفاظت کے لئے اِدگرد مورچہ بندی کی اور خندق کھودی۔

مسلمانوں کے لئے یہ بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ ایک طرف قحط و دوسر افلاس۔ اس پر دشمن زبردست۔ لیکن اسلام کی صداقت کی وجہ سے

وہ ان مصائب کو اپنی خوشی اور دائمی راحت کا سبب سمجھتے تھے اور اللہ تعالےٰ کی مرضی کے لئے ان سب تکالیف کو جھیلتے تھے ۔

اس خندق کے کھودنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک تھے ۔ کئی کئی دن جب فاقے سے گذر جاتے تھے تو جھکتے نہیں بنتی تھی ۔ اس لئے شکم پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے ۔

کافروں سے لڑائی شروع ہوئی ۔ ایک دن جبکہ تمام مسلمان لڑائی میں مشغول تھے ، اور عورتیں اور بچے پیچھے ایک محفوظ کوٹ میں چھوڑ دئے گئے تھے جہاں کوئی ان کی حفاظت کے لئے موجود نہیں تھا ۔ چند شریر یہودیوں نے یہ سوچا کر چلو مسلمانوں کے حرم پر چھاپا ماریں ۔ وہ لوگ اس ارادے سے کوٹ کی دیوار سے لگ کر آ کھڑے ہوئے اور ایک شخص کو اس کے دروازے کے قریب بھیجا کہ تم کان لگا کر سنو اور خبر لاؤ کہ اندر کچھ مسلمان تو حفاظت کے لئے نہیں موجود ہیں ۔ وہ آ کر چپ چاپ دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا اور اندر کی آواز پر کان لگایا ۔

حضرت صفیہ رضؓ نے اس کو اوپر سے دیکھ لیا ۔ وہاں کوئی مرد موجود نہیں تھا ۔ صرف حضرت حسان جو دربار نبوت کے شاعر ہیں عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے گئے تھے ۔ حضرت صفیہ رضؓ نے ان سے کہا کہ دیکھو دروازے پر ایک یہودی کھڑا ہوا ہے اور وہ یقیناً جاسوسی کے لئے

آیا ہے۔ لہٰذا تم جا کر اس کو قتل کر دو۔ حضرت حسانؓ میں یہ جرأت کم تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ یہ سُن کر حضرت صفیہ رضؓ کو بہت ہی اندیشہ ہوا انھوں نے خیال کیا کہ یہ جا کر ضرور خبر دے گا کہ اس کوٹ میں کوئی مرد نہیں ہے، اور یہودی آ کر ہم کو لوٹ لیں گے۔ مسلمان دشمن کے مقابلے میں ہیں وہ ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ یہ سوچ کر وہ خود دروازے پر آئیں اور آہستہ آہستہ پٹ کھول کر ایک دم اس یہودی پر حملہ کیا اور ایک ایسا لٹھ اس کے سر پر مارا کہ وہ گر کر مر گیا۔

اندر آ کر اُنھوں نے حضرت حسان کو خبر کی۔ اور کہا کہ تم جا کر اس کا سامان تو کم از کم لے لو کیونکہ اس کے اسلحہ وغیرہ میں نے محض اس وجہ سے نہیں نکالے کہ وہ مرد ہے۔ لیکن حضرت حسان اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔

آخر وہ خود جا کر اس کا سر کاٹ لائیں اور اس طرف سے جا کر دیوار کے نیچے پھینکا جہاں اس کے ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سر کو دیکھ کر ڈر گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ یہاں ضرور کچھ مسلمان حفاظت کے لئے ہیں

حضرت صفیہ رضؓ عربی اشعار اور روایات کا بہت علم رکھتی تھیں۔ اور خود بھی شاعر تھیں۔ آنحضرت کی رحلت پر مرثیے میں اشعار کہے ہیں۔

سنہ ۲۰ھ میں عہد خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔ مدفن جنت البقیع ہے۔

حضرت اسماءؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں۔ ہجرت سے ۲۷ سال پہلے مکے میں پیدا ہوئیں، اُن کی والدہ کا نام قتیلہ تھا جو قریش کے ایک مشہور اور نامور سردار عبدالعزیٰ کی بیٹی تھیں۔ عبداللہ ابن ابوبکرؓ ان کے حقیقی بھائی اور حضرت عائشہؓ ان کی سوتیلی بہن تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے پہلے آنحضرت پر ایمان لائے ان کے مسلمان ہونے کے چند روز بعد حضرت اسماء ایمان لائیں۔ یہ سترھویں مسلمان تھیں۔ اُن کی والدہ قتیلہ نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا اس وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو طلاق دے دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے کافروں نے جب بہت تنگ کیا یہاں تک کہ قتل کر ڈالنے پر تیار ہوئے تو آپ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ بھی آپ کے ہمراہ ہوئے اور رات کو دونوں آدمی نکل کر مکّے سے تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑ میں جس کو جبل ثور کہتے ہیں جا کر

ایک غار میں چھپ رہے تاکہ کافر پیچھا کر کے پکڑ نہ لیں۔ تین دن تک اسی غار میں بیٹھے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو اسی وجہ سے یار غار کہتے ہیں۔ کافر چاروں طرف اُن کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرے۔ بارہا اسی غار کے منہ پر گذرے لیکن اللہ تعالےٰ نے اُن کو محفوظ رکھا۔

حضرت اسمار چپکے سے رات کو کھانا لے کر جاتی تھیں اور غار میں اُن کو کھلاآتی تھیں۔ اُن کے بھائی عبداللہ جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے دن بھر کافروں کے ارادوں اور مشوروں کا پتہ لگایا کرتے تھے اور رات کو غار میں پہنچ کر تمام خبریں سُنادیا کرتے تھے۔ عامر حضرت ابوبکر کا چرواہا رات کو اُن کی بکریاں غار کے منہ پر لاتا تھا۔ بقدر ضرورت دودھ دے جاتا تھا اور حضرت اسمار اور عبداللہ کے نقش قدم اپنی بکریوں کے کھروں سے مٹادیتا تھا تاکہ کفار کو اس کے ذریعے سے غار کا سُراغ نہ لگ جائے۔

آخرکار کافر تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر ابھی تک ان کو کسی قدر اُمید باقی تھی انھوں نے سو اونٹ کا انعام اس شخص کے لئے مقرر کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے لائے۔ تیسرے دن رات کو جب اسمار کھانا لے کر گئیں تو آپ نے اُن سے کہا کہ تم علی رضؓ سے جا کر کہو کہ وہ کل رات کے وقت ہمارے لئے تین اونٹ اور ایک راہبر تلاش کر کے اسی غار میں بھیجیں۔ حضرت علی رضؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت اسمار زادِ راہ تیار کر کے

لے گئیں۔ دسترخوان کو باندھنے کے لیے رسّی کی ضرورت ہوئی مگر وہاں رسّی کہاں؟ حضرت اسمار نے جھٹ پٹا پنا نطاق (ایک رومال جس کو عرب عورتیں قمیص کے اوپر کمر پر باندھتی ہیں) کھول کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیئے ایک سے دسترخوان باندھا دوسرے سے مشکیزہ کا منہ۔ اسی دن دربارِ نبوت سے اُن کو ذات النطاقین کا لقب ملا۔

حضرت ابوبکرؓ جب اسلام لائے تھے تو اُن کے پاس چالیس ہزار دینار یعنی تقریباً ایک لاکھ روپے تھے۔ وہ تمام دولت انھوں نے آں حضرت اور دینِ اسلام کی امداد میں صرف کردی۔ ہجرت کے وقت کل پانچ ہزار درہم یعنی تقریباً ڈیڑھ ہزار روپئے اُن کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی اپنے بیٹے عبداللہ سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیے کہ مدینے میں آں حضرت کے کام آئیں گے۔ اور بال بچوں کو اللہ کے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے۔

حضرت اسمار ان لوگوں کو رخصت کر کے گھر آئیں۔ صبح کو ابو قحافہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بعد میں اسلام لائے) اُن کے گھر میں آئے۔ بہت بڈھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت رنج کے ساتھ کہنے لگے کہ نہایت افسوس ہے کہ ابوبکر خود بھی چلے گئے اور تمام مال بھی ساتھ لے گئے۔ تم لوگوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔ حضرت اسمار نے اُن کی طبیعت کو تسکین دلانے کے لئے ایک

تھیلی کنکر پتھر سے بھر کر اسی طاق میں رکھ دی جس میں حضرت ابوبکر رض روپئے رکھا کرتے تھے اور اُن سے کہا کہ دادا میاں! وہ تو ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ اور اُن کا ہاتھ لے جا کر اس طاق پر رکھ دیا۔ ابو قحافہ سمجھے کہ حقیقت میں یہ روپئے ہیں۔ اُن کو اطمینان ہوگیا اور بولے خیر۔ تب کچھ ہرج نہیں۔

مدینہ میں پہنچ کر حضرت ابوبکر رض نے تین اونٹ بھیجے۔ اور عبداللہ کو لکھا کہ تم سب کو لے کر چلے آؤ۔ چنانچہ وہ حضرت عائشہ رض اور اُن کی والدہ ام رومان اور حضرت اسماء کو لے کر مدینے روانہ ہوئے۔

ان کا نکاح حضرت زبیر رض کے ساتھ ہوا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور جن کو حواری کا لقب ملا تھا۔ خود حضرت اسماء کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے کہ

"جب میرا نکاح زبیر رض کے ساتھ ہوا تو اُن کے پاس کچھ نہ تھا، نہ کوئی غلام تھا۔ نہ کچھ مال تھا نہ سامان تھا۔ صرف ایک گھوڑا تھا میں ہی اس گھوڑے کی سائیسی کی خدمت انجام دیتی تھی آنحضرت نے زبیر رض کو ایک نخلستان عطا فرمایا تھا جو مدینے سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ میں وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں روزانہ اپنے سر پر اٹھا کر لاتی۔ خود ہی دلتی پھر گھوڑے کو کھلاتی۔ اس کو پانی پلاتی

اس کا ساز سیتی۔ گھر کا جو کچھ کام کاج ہوتا وہ بھی میں ہی کرتی تھی
مجھے اچھی روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ آٹا گوندھ کر اپنے پڑوس میں انصار
کی بیویوں کو جو نہایت خلوص اور محبت رکھنے والی بیویاں تھیں اور
دوسروں کا کام کرکے ان کو دلی خوشی ہوتی تھی۔ دے آیا کرتی تھی
وہ پکا دیا کرتی تھیں۔ اس قدر دشواری اور مشکل میں دیکھ کر میرے
باپ نے میرے پاس ایک غلام بھیج دیا جس کی بدولت گھوڑے کی
سائیسی سے مجکو سبکدوشی ہوگئی۔ انھوں نے غلام کیا بھیجا گویا
مجکو آزاد کر دیا"

حضرت زبیر رضؓ عرب کے اُن لوگوں میں سے تھے جو بہادری میں ہمیشہ
مانے گئے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانے میں اور اُن کے بعد بھی برابر لڑائیوں
میں شریک رہے۔ شام اور مصر کی فتوحات میں ان کے بڑے کارنامے
ہیں حضرت اسمار بھی ان کے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ جنگ یرموک جو شام
میں سب سے بڑی لڑائی ہوئی اس میں بھی موجود تھیں۔ حضرت عمر رضؓ نے
ایک ہزار درہم سالانہ ان کی تنخواہ مقرر کی تھی۔

جس زمانے میں سعید ابن العاص رضؓ مدینہ شریف کے حاکم تھے
اس زمانے میں وہاں چوریاں بہت ہونے لگی تھیں۔ حضرت اسمار رضؓ
اپنے سرہانے خنجر رکھ کر سویا کرتی تھیں۔

اُن کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ان کے نام یہ ہیں:۔
عبداللہ، عروہ، منذر، عاصم، مہاجر، خدیجہ، ام الحسن
عائشہ رضی اللہ عنہم

ان کے تمام بیٹوں کے تاریخ اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ عروہ رض بہت بڑے محدث ہوئے۔ حضرت عبداللہ رض جو بعد ہجرت اسلام کے اولین فرزند ہیں، خلیفہ ہی ہو گئے تھے۔

باوجودیکہ حضرت اسماء رض کے گھر میں دولت کی کچھ انتہا نہ رہی مگر وہ اپنی اسلامی سادگی پر رہیں۔ ہمیشہ موٹا پہنتیں اور درویشی کے ساتھ بسر کرتیں۔ اُن کے بیٹے منذر رض جب عراق کی لڑائی ختم کرکے لوٹے تو کچھ زنانے خوب صورت کپڑے ان کے لئے لائے۔ انھوں نے منظور کیا اور نہ واپس کر دیا۔ منذر رض پھر موٹے کپڑے لیکر خود اُن کی خدمت میں گئے، اور پیش کیا۔ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ "ہاں مجکو ایسے ہی کپڑے پہنایا کرو۔

فیاضی جو عرب کا اصلی جوہر ہے۔ حضرت اسماء رض کے مزاج میں بہت تھی۔ اپنے تمام بال بچوں کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں کہ مال اپنا اور دوسروں کا کام نکالنے کے لیئے ہے نہ کہ جمع کرنے کے لئے اگر تم اللہ کی مخلوق سے اپنے مال کو روکو گے تو اللہ بھی اپنی نعمتوں کو تم سے روک رکھے

گا۔ جو تم نے صدقہ کیا وہی دراصل تمہارا ذخیرہ ہے اور وہ کبھی کم نہ ہوگا۔ ان کو کبھی کبھی درد سر کا دورہ ہو جایا کرتا تھا۔ اس وقت جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا غریبوں کو بانٹ دیتی تھیں اور جس قدر غلام ہوتے تھے، سب کو آزاد کر دیتی تھیں۔ کیونکہ صدقہ سے انسان کی بلائیں رد ہو جاتی ہیں۔

شرک کی ایسی سخت دشمن تھیں کہ ان کی ماں قتیلہ کچھ تحفے تحائف لے کر مدینے میں اُن کو دیکھنے آئیں۔ انھوں نے اُن کے تحفے لینے سے انکار کر دیا، اور گھر میں نہیں داخل ہونے دیا۔ کیونکہ وہ اب تک مشرک تھیں۔ حضرت عائشہ کے پاس کہلا بھیجا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تحفے قبول کرو اور ان کو مہمان رکھو تب ان کو گھر میں لا کر مہمان رکھا۔

سنہ ھ میں اُن کے بیٹے عبداللہ مدینے سے مکے میں آگئے۔ حضرت اسمار کو بھی جو بڑھاپے کی وجہ سے اندھی ہو چکی تھیں بلا لیا۔ حضرت عبداللہ جیسا فرماں بردار بیٹا ہونا بھی بہت ہی مشکل ہے وہ اپنی اس بوڑھی ماں کی بہت اطاعت کرتے تھے اور اُن کی رضامندی کو اپنے تمام مقاصد کی کنجی سمجھتے تھے۔

سنہ ۶۹ھ میں وہ عرب اور عراق وغیرہ کے خلیفہ ہو گئے۔ سات

برس خلافت کرنے کے بعد عبدالملک ابن مروان کے وزیر حجاج نے اُن پر بڑی بھاری فوج لے کر چڑھائی کی اور یکم ذی الحجہ ۷۲ھ کو مکے کا محاصرہ کر لیا۔ چاروں طرف سے رسد کی آمد بند کر دی۔ چھ مہینے تک لڑائی جاری رہی۔ حضرت عبداللہؓ کے مددگار وجہ کمی رسد کے ٹوٹ ٹوٹ کر حجاج سے جا ملے، اور اُن کے پاس تھوڑے سے آدمی رہ گئے۔

آخر شہر پناہ کے دروازے بھی لوگوں نے کھول دئیے اور دشمن چاروں طرف سے گھس پڑے۔ حضرت عبداللہؓ اپنی ماں کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ بیٹا اگر تو سمجھتا ہے کہ حق پر ہے تو مردوں کی طرح لڑ، اور ذلت کی کوئی بات جان کے خوف میں آکر ہرگز برداشت نہ کر۔ عزت کے ساتھ تلوار کھانا زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ ذلت کے ساتھ آدمی دنیا کی نعمتیں کھائے۔

حضرت عبداللہ بہادری کے ساتھ لڑے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ آخر زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ حجاج نے اُن کا سر کاٹ کر عبدالملک کے پاس بھیج دیا اور حضرت اسماءؓ کے پاس جا کر کہا کہ تمہارے بیٹے کو میں نے اس لئے قتل کیا کہ اس نے اللہ کے گھر میں بے دینی اور بغاوت پھیلائی تھی۔ حضرت اسماءؓ نے کہا کہ واللہ میرا بیٹا بے دین نہ تھا۔ بڑا پرہیزگار عبادت گزار اور اپنی ماں کا فرماں بردار تھا۔ مگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث

سنی ہے کہ قبیلہ ثقیف سے دو دجّال پیدا ہوں گے جن میں سے دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا۔ پہلا تو گذر چکا (مختار ثقفی) دوسرا تو ہے۔ حجاج اُن کے اس بے ہراس اور تلخ جواب سے جل گیا اور اس نے عبداللہ رض کی نعش حجون پہاڑی پر لٹکا دی۔ اور کہا کہ جب تک اسمار رض خود آکر نہ مانگیں وہیں لٹکی رہے تین دن گذر گئے۔ تیسرے دن بھی جب حضرت اسمار رض نے سنا کہ اب تک نعش لٹکی ہوئی ہے تو کہا کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ یہ سوار اُترے۔ جب یہ خبر لوگوں نے سنا تو حجاج سے سفارش کی، اس لئے نعش اُتروا دی اور وہ دفن کی گئی۔ حضرت اسمار رض کی عمر اس وقت سو برس کی تھی اُن کا کوئی دانت نہیں ٹوٹا تھا اور تمام قوے صحیح وسالم تھے۔ البتہ آنکھوں سے معذور ہو گئی تھیں۔ عبداللہ رض کے مارے جانے کے بیس روز کے بعد، ۲۰ جمادی الاول ۷۳ھ میں انتقال کیا۔ مکہ میں دفن ہوئیں۔

ام عمارہ رضؓ

اُن کا نام نسیبہ ہے لیکن یہ اپنی اسی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ باپ کا نام کعب ہے جو قبیلہ بنی نجار میں سے تھے۔ اُن کی والدہ رباب بنت عبداللہ قبیلہ خزرج میں سے تھیں۔ ہجرت سے تقریباً چالیس سال قبل اُن کی ولادت مدینے میں ہوئی۔

ان کا نکاح انھی کے چچازاد بھائی زید بن عاصم کے ساتھ ہوا اُن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ عبداللہ اور حبیب۔ زید بن عاصم کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا نکاح انھیں کے قبیلے کے ایک شخص عزیہ بن عمر سے ہوا۔ ان سے ایک بیٹا تمیم اور ایک بیٹی خولہ پیدا ہوئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو مکے کے اکثر لوگ دشمن ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی سخت مخالفت شروع کی جو لوگ مسلمان ہوتے تھے ان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے، اُن کی ایذا رسانی کی وجہ سے کوئی مسلمان مکے میں مشکل سے ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ سب کو حبشہ کی طرف بھیج دیا کرتے تھے، کیونکہ

وہاں کا بادشاہ مسلمانوں کا بڑا حامی تھا اور اُن کو آرام دیتا تھا۔

جب آپ نے سالہا سال کوشش کرکے دیکھ لیا کہ وہ لوگ اسلام نہیں لاتے اللہ تعالےٰ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور اُن کی عداوت اور دشمنی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے تو اُن کا پیچھا چھوڑ دیا اور بڑے بڑے بازاروں اور مجمعوں میں جہاں عرب کے تمام قبائل جمع ہوتے تھے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے لگے۔ یہ خواہش بھی تھی کہ اگر کوئی دوسرا قبیلہ اسلام کی حمایت کے لئے آمادہ ہو جائے تو آپ مکہ والوں کو چھوڑ کر انھیں میں جا ملیں۔

اتفاق سے ایک سال مدینے کے چھ آدمی آپ کا وعظ سُن کر مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال چھ اور بڑھے۔ اب حضور نے ایک صحابی کو جن کا نام مصعب بن عمیر رضؓ تھا مسلمانوں کے ساتھ مدینے کو روانہ کر دیا کہ وہاں قرآن کی تعلیم دیں۔ حضرت مصعب رضؓ اور ان بارہ مسلمانوں کی کوشش سے مدینے کے بڑے بڑے سردار اسلام لائے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھیں اسلام لانے والوں میں حضرت اُم عمارہ رضؓ اور ان کا گھرانہ ہے۔

تیسرے سال مدینے سے ۷۵ مسلمان مکے پہنچے۔ مشرکوں کے خوف سے حج کے دو تین دن کے بعد رات کو پچھلے پہر ایک پہاڑی کی گھاٹی میں یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ وہاں حضور کے ہاتھ پر ان سب لوگوں نے

بیعت کی۔ اور یہ عہد و پیمان ہوا کہ "حضور مدینے تشریف لے چلیں۔ ہم جان و مال اور اولاد سب کچھ اللہ کے دین کی مدد میں قربان کریں گے" اسی کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس میں شریک تھے۔ اُن کا درجہ تمام انصار میں بلند ہے۔ اس بیعت میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک تو یہی ام عمارہ رضؓ اور دوسری ام منیع رضؓ

اس عہد و پیمان کے مطابق آنحضرت مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے۔ کفار مکہ نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا کئی بار چڑھائی کر کے آئے اور لڑائیاں کیں۔ سب سے پہلے ۲ھ میں بدر کی لڑائی ہوئی جس میں مکے کے کافروں کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اللہ تعالےٰ نے اسلام کو کفر پر نمایاں فتح عطا فرمائی۔ کفار نے اپنے سرداروں کا بدلہ لینے کی غرض سے بڑی سخت تیاری کی اپنے آس پاس کے تمام قبیلوں کو جمع کیا سب کو ہتھیار اور سواری دی اور تین ہزار سے کچھ زیادہ جنگی آدمی جمع کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سُن کر مسلمانوں کو جمع کیا۔ تقریباً ایک ہزار آدمی تھے۔ ان کو لے کر جب لڑائی کے لئے نکلے تو ان میں بھی تین سو منافق راستے سے واپس چلے آئے۔ اب صرف سات سو مسلمان رہ گئے۔ منافقوں کے بھاگ آنے سے ان کا حوصلہ بھی

پست ہو گیا تھا۔ مگر آنحضرت نے اُن کو ہمّت دلائی اور اللہ پر بھروسہ کر کے مقابلے کے لئے بڑھے۔

مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جس کا نام اُحد ہے۔ اس کے دامن میں شنبہ کے دن ۱۱۔ شوال ۳ھ کو مقابلہ ہوا۔ مسلمان اچھے موقع پر پہنچ گئے تھے۔ کافروں میں سات آٹھ سو سوار تھے حضرت خالد بن ولید جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے ان سواروں کے سردار تھے۔ ایک نہایت محفوظ درہ تھا اور سوائے اس درہ کے ان سواروں کے آنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ آنحضرت نے اس درہ پر پچاس مسلمانوں کو مقرر کر دیا کہ اس طرف سے جب سوار حملہ کریں تو تم لوگ ان کو روکنا آگے نہ بڑھنے دینا۔ اور جب تک ہم حکم نہ دیں اس وقت تک ہرگز اس جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ لوگ لوہے کی دیوار کی طرح وہیں جم گئے۔ جب کفار ادھر سے آنے لگے تو ان تھوڑے سے مسلمانوں نے ان کو تیروں پر رکھ لیا۔ مجبور ہو کر رک گئے اور میدان میں نہ آسکے۔ اور ادھر گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ قریب تھا کہ مشرکوں کو شکست ہو جائے کہ اتنے میں اسلامی فوج کا علم بردار شہید ہو گیا بعض کافروں نے سمجھا کہ یہی رسول اللہ تھے۔ انھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ ہم نے نبی کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں نے جب یہ آواز سُنی تو اکثر بدحواس ہو گئے۔ ان کو کسی چیز کی خبر نہیں رہی، کوئی جہاں تھا وہیں مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ کوئی گر پڑا۔ کوئی بیہوش ہو گیا۔ کسی کی آنکھیں کھُلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ مشرک خوشی کے جوش میں ٹوٹ پڑے۔ درہ پر جو مسلمان تھے وہ بھی سراسیمہ ہو کر دوڑے کہ یہ کیا ماجرا گزرا۔ اُن لوگوں کا وہاں سے ہٹنا تھا کہ خالد رضؓ نے اپنے سواروں کو لے کر حملہ کیا اور قیامت پر قیامت برپا کر دی۔ سرورِ کائناتؐ کے عم محترم امیر حمزہؓ اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے، اور بہتوں کے میدان سے قدم اُکھڑ گئے۔

اس سخت وقت میں حضور کے ارد گرد صرف چند مسلمان جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہو گی، حفاظت کے لئے رہ گئے۔ انھیں میں ام عمارہ رضؓ ان کے دونوں بیٹے عبداللہ اور حبیب اور اُن کے شوہر غزیہ بن عمر رضؓ تھے۔ خود حضرت ام عمارہ رضؓ کی زبانی مورخوں نے اس واقعہ کی کیفیت لکھی ہے، ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

"ام عمارہ رضؓ نے کہا کہ میں اپنے کندھے پر مشک لئے ہوئے پیاسوں کو پانی پلا رہی تھی۔ یکایک مسلمانوں نے شکست کھائی اور اُن کے قدم اُکھڑ گئے۔ کفار نے چاروں طرف سے سخت حملہ کیا میں نے اسی وقت مشک پھینکی، اور ایک تلوار اُٹھا کر آنحضرت کی حفاظت کے

لئے کھڑی ہوگئی۔ میرے پاس ڈھال نہ تھی کسی پلٹ کر جانے والے کی طرف حضرت نے اشارہ کیا وہ اپنی ڈھال پھینکتا گیا میں دشمنوں کے تیروں اور تلواروں کو اسی ڈھال پر روکنے لگی مصیبت یہ تھی کہ ہم پیدل تھے اور غنیم سواریوں پر۔ اگر وہ بھی ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم آسانی سے اُن سے بھگت لیتے۔ سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ اُن کا روکنا بہت دشوار تھا میں نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی سوار وار کرتا تو اس کو روک لیتی اور جوں ہی وہ آگے بڑھتا پیچھے سے ایک ایسا وار کرتی کہ اس کے گھوڑے کا پاؤں کٹ جاتا اور وہ مع سوار کے گر پڑتا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے بیٹے عبداللہ کو زور سے آواز دیتے کہ اپنی ماں کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور میں اور وہ دونوں مل کر اس سوار کا خاتمہ کر دیتے۔

حضرت ام عمارہ رضؓ کے بیٹے عبداللہ رضؓ کی زبانی روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"میں اور میری ماں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں دوسری طرف مشغول تھا کہ ایک مشرک نے پیچھے سے آکر میرے بازو پر ایک تلوار ماری۔ زخم بہت کاری پڑا میں

نے مڑکر اس پر حملہ کیا لیکن وہ سیدھا نکل گیا۔ میں لڑ رہا تھا مگر
میرا خون نہیں بند ہوتا تھا۔ حضور نے ام عمارہ رض کو حکم دیا کہ اس کے
زخم پر پٹی باندھو۔ وہ اپنے ساتھ اسی غرض کے لئے بہت سی پٹیاں
لائی تھیں۔ فوراً ایک پٹی نکال کر خوب مضبوط باندھی اور بولیں
کہ بیٹا اٹھو اور لڑو۔ میں خون کے نکلنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا
اٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے ام عمارہ رض
ہر شخص میں وہ طاقت کہاں ہوتی ہے جو تجھ میں ہے۔ اتنے میں
وہ شخص جس نے مجھے زخمی کیا تھا پھر پلٹ کر اسی طرف آیا۔ آنحضرت
نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ اے ام عمارہ رض دیکھ یہی شخص آ رہا ہے
جس نے عبداللہ کو زخمی کیا ہے۔ ام عمارہ رض نے لپک کر اس پر
تلوار کا وار کیا۔ اس کی ایک پنڈلی صاف کٹ گئی اور وہ اسی جگہ
دھم سے گر پڑا۔ پھر انھوں نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا
حضور مسکرائے اور فرمایا کہ ام عمارہ رض، اللہ تعالےٰ نے بڑا تازہ بدلہ
تجھکو عطا کیا۔"

کئی گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ حضرت ام عمارہ رض کے زخموں کا کچھ
شمار نہ تھا لیکن وہ ذرا بھی ان زخموں کی پروا نہیں کرتی تھیں اور برابر
چستی اور چالاکی کے ساتھ حضور کی حفاظت میں مشغول تھیں۔

اسی درمیان میں کسی کافر نے ایک پتھر پھینک مارا جس سے سرورِ کائنات کا بھی نیچے کا لب زخمی ہو گیا اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں میں سے داہنا دانت شہید ہو گیا۔ پھر ایک کافر نے جس کا نام ابن قمیئہ تھا اور جو بہت بہادر اور مشہور سوار تھا۔ آپ پر تلوار کا وار کیا۔ جس سے خود کے دو حلقے رخسار مبارک میں دھنس گئے۔ حضرت ابی عبیدہ بن الجراح رضؓ نے ان حلقوں کو نکالا۔ رخسار مبارک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت ام عمارہ رضؓ نے بیتابی کے ساتھ اچھل کر ابن قمیئہ پر حملہ کیا۔ اس نے ان کے مونڈھے پر ایک تلوار ماری جس سے ایک بڑا گہرا زخم آیا۔ باوجود اس زخم لگنے کے بھی حضرت ام عمارہ رضؓ نے اس پر تلوار کے پیاپے کئی وار کئے لیکن وہ دشمنِ خدا دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔

ابن قمیئہ تو بھاگ گیا۔ لیکن حضرت ام عمارہ رضؓ کو بڑا کاری زخم لگا تھا خون میں لت پت ہو گئیں۔ حضور نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر ان کے زخم پر پٹی بندھوائی اور فرمایا کہ واللہ ام عمارہ رضؓ کا آج کا کارنامہ فلاں فلاں (چند بہادر صحابہ کے نام لے کر) کے کارناموں سے بہت بڑھ کر ہے۔ ام عمارہ رضؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے لئے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہمراہ مجھکو جنت میں داخل کرے۔ آپ نے دعا فرمائی ام عمارہ رضؓ نے کہا کہ بس اس کے بعد دنیا میں جو مصیبت چاہے میرے

سر پر گذر جائے مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں ۔

میدانِ جنگ سے جن مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے اُن میں سے بعض بعض مدینہ کے قریب تک پہنچ گئے۔ ایک صحابیہ جن کا نام ام ایمن رض تھا مدینے سے مشک لے کر احد کی طرف آرہی تھیں کہ مسلمانوں کو پانی پلائیں۔ دیکھا کہ لوگ بھاگے آرہے ہیں۔ کیفیت پوچھی۔ انھوں نے واقعہ بیان کیا۔ حضرت ام ایمن رض نے زور سے چلّا کر اُن کو ڈانٹا اور مٹھی میں خاک بھر کر ان کی طرف پھینکی۔ اور کہا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ کس منہ سے یہاں چلے آئے مرد بنے ہو لو۔ یہ ہماری چوڑیاں پہنو۔ گھر کا چولھا چکی سنبھالو اور اپنی تلواریں ہم کو دیدو ہم جاکر لڑیں۔ اُن کے اس کہنے سے غیرت مند مسلمان پلٹے۔ اُدھر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہیں اب ان کی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھی اور میدان میں جم گئے۔ ظہر کے وقت لڑائی ختم ہوگئی۔ حضرت ابوبکر رض حضرت عمر رض اور بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ آپ پہاڑ پر گئے۔ وہاں نماز پڑھائی پھر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے

حضور کو ام عمارہ رض کا بڑا خیال تھا۔ آنے کے ساتھ ہی عبداللہ بن کعب رض کو اُن کے دیکھنے کے لئے بھیجا۔ معلوم ہوا کہ اب حالت اچھی ہے۔ زخم مہلک نہیں ہے۔ تب آپ کو اطمینان ہوا۔ پورے ایک سال تک علاج کرنے کے بعد یہ زخم اچھا ہوا۔

بالاتفاق تمام مؤرخ لکھتے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ، خیبر اور حنین کی لڑائیوں میں بھی ام عمارہ رضہ آنحضرت کے ہمراہ شریک ہوئیں لیکن مجکو اب تک کسی کتاب سے ان لڑائیوں میں ان کے کارناموں کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ جنگ یمامہ کا حال جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ لکھتا ہوں۔

اہل یمامہ کا سردار مسلیمہ کذاب ایک نہایت زبردست اور بڑا جابر شخص تھا۔ پہلے تو مسلمان ہوا پھر دنیا کے لالچ میں مرتد ہوگیا۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد اس نے بڑی سرکشی پر کمر باندھی۔ اس کا قبیلہ بہت بڑا تھا لڑنے والے تقریباً چالیس ہزار آدمی تھے اس نے اپنی اس قوت کے گھمنڈ میں آکر نبوت کا دعوے کر دیا۔ اور سب اپنے آپ کو نبی کہلوانا شروع کیا۔ جو نہ کہتا اس کو طرح طرح کی سزائیں دیتا۔

حضرت ام عمارہ رضہ کے بیٹے حبیب رضہ عمان سے مدینہ شریف کو آرہے تھے مسیلمہ نے راستے سے ان کو پکڑ لیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اس نے کہا نہیں۔ یہ گواہی دو کہ مسیلمہ رسول اللہ ہے۔ انھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ تب اس نے ان کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا الغرض پھر پاؤں کلٹے۔ رانیں کاٹ ڈالیں۔ لیکن انھوں نے اس کذاب کی نبوت کا اقرار نہ کیا پر نہ کیا اور جان دیدی۔ حضرت ام عمارہ رضہ

نے جب یہ واقعہ سُنا تو کلیجہ تھام کے رہ گئیں اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اگر مسلمانوں نے لشکر کشی کی تو اس مرتد ظالم کو میں انشاء اللہ خود اپنی تلوار سے جہنم رسید کروں گی۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ نے جب مسلیمہ کذاب کے حالات سنے تو حضرت خالد بن ولیدؓ کو چار ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا حضرت ام عمارہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئیں اور اُن سے اجازت چاہی کہ اس لڑائی میں مجھے بھی جانے دیجئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم تمھاری بہادری اور جرأت بہت اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے تم شوق سے جاؤ ہم تم کو روک نہیں سکتے۔

مسلیمہ کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی قدم قدم پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بارہ سو مسلمان شہید ہو گئے اور آٹھ نو ہزار کافر مارے گئے۔ اس کشمکش اور ہنگامہ میں حضرت ام عمارہ رضؓ نے اپنی نگاہ کے سامنے مسلیمہ کو رکھ لیا جنگی بہادروں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی برچھی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ نکالتی ہوئی غنیم کی بیچ فوج میں گھستی چلی جا رہی تھیں۔ نیزے اور تلوار کے گیارہ زخم لگے اور جب مسلیمہ کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو کلائی پر سے ایک ہاتھ بھی کٹ گیا۔ لیکن مطلق پرواہ نہ کی اور آگے بڑھی تھیں کہ

مسلیمہ پر وار کریں اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک ساتھ اس پر دو تلواریں پڑیں اور وہ کٹ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ انھوں نے دیکھا تو اُن کے بیٹے عبد اللہ کھڑے ہیں۔ پوچھا کہ تو نے اس کو قتل کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک تلوار میری پڑی ہے دوسری وحشی کی (یہ وحشی وہ ہے جس نے اپنی کفر کی حالت میں جنگ احد میں حضرت امیر حمزہؓ کو شہید کیا تھا) اب معلوم نہیں کہ کس کے وار سے وہ مرا ہے۔ یہ دیکھ کر ام عمارہؓ اسی وقت سجدہ میں گر گئیں۔ اور اللہ تعالےٰ کا شکریہ ادا کیا۔

زخموں کی وجہ سے اور خاص کر ہاتھ کٹ جانے سے وہ کم زور ہو گئی تھیں۔ حضرت خالدؓ جو فوج کے سردار تھے اور جن کی بہادری ضرب المثل ہے وہ ام عمارہ رضؓ کی شجاعت اور بزرگی کی وجہ سے اُن کا بڑا ادب کرتے تھے۔ انھوں نے اُن کے زخموں کے علاج اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ چنانچہ حضرت ام عمارہ رضؓ نے بعد میں کمال شکر گذاری کے ساتھ خالد رضؓ کی تعریف کی کہ وہ نہایت ہمدرد شریف النفس اور متواضع سردار ہیں۔ انھوں نے بہت غم خواری کے ساتھ ہماری تیمار داری کی۔"

جب حالت کچھ ٹھیک ہو گئی تو عبد اللہ ان کو مدینے میں لائے خود خلیفۂ وقت حضرت ابو بکر رضؓ ان کو دیکھنے کے لیۓ اُن کے گھر آتے تھے

حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے زمانے میں ایک مرتبہ مال غنیمت میں چند بیش قیمت کپڑے آئے۔ ان میں سے ایک پٹہ فرزگشں نہایت قیمتی تھا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو یہ رائے دی کہ آپ اسے اپنے بیٹے عبداللہؓ کی بیوی کو دیں۔ کسی نے کہا کہ نہیں بلکہ اپنی بیوی ام کلثومؓ کو دیجیے جو حضرت علیؓ کی بیٹی ہیں۔ غرض مختلف لوگوں نے مختلف رائیں ظاہر کیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اس کا حقدار ام عمارہؓ کو سمجھتا ہوں۔ انھیں کو دوں گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے احد کے دن سنا تھا (آپ فرماتے تھے) کہ میں جدھر نظر ڈالتا تھا ام عمارہؓ ہی ام عمارہؓ مجکو نظر آتی تھیں دائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہؓ، بائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہؓ چنانچہ انھیں کے پاس اس کو بھیج دیا۔

راقم کو اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

حضرت ام سلیمؓ

ان کا نام رمیصا ہے۔ اور ملحان بن خالد کی بیٹی ہیں جو مدینہ کے باشندے اور انصار کے قبیلہ بنی نجار میں سے تھے۔ ان کی والدہ کا نام ملیکہ تھا۔ ولادت ہجرت سے تخمیناً تیس سال پہلے ہوئی تھی اُن کا نکاح انھیں کے قبیلہ کے ایک شخص کے ساتھ ہوا تھا جن کا نام مالک تھا۔ اُن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انس بن مالک رکھا۔

انسؓ ابھی دودھ پیتے تھے کہ مدینہ میں خبر پہنچی کہ مکہ میں ایک نبی پیدا ہوا ہے، اور وہ اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ مدینہ کے لوگ سال بہ سال مکہ کو حج کے لئے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے جب آنحضرتؐ کو دیکھا اور کلام اللہ کی آیتیں سُنیں تو ان میں سے بعض لوگ مسلمان ہو گئے۔ ام سلیمؓ نے بھی انھیں مسلمانوں کی زبانی آنحضرتؐ کے حالات اور کلام پاک کی آیتیں سُنیں۔ ان کے دل میں بھی اسلام کی سچائی اثر کر گئی، اور وہ بھی مسلمان ہو گئیں۔

انھوں نے اپنے ننھے بیٹے انسؓ کو کلمہ سکھانا شروع کیا۔ ان کے

شوہر مالک بہت خفا ہوتے تھے کہ خود بیدین ہوئی اور میرے بچے کو بھی خراب کرنا چاہتی ہے۔ حضرت ام سلیم رضؓ کہتیں کہ یہ تو بچہ ہے میں تو یہ کوشش کروں گی کہ تم بھی اسلام کی سچائی کو سمجھو اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرو۔

اسی درمیان میں مالک کو کہیں سفر کرنا پڑا۔ راستے میں کسی دشمن نے اُن کو قتل کر ڈالا۔

حضرت ام سلیم رضؓ کو انس رضؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی۔ مالک کے قتل ہونے کے بعد بہت سے لوگوں نے اُن کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن اُنھوں نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک میرا بیٹا اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ مجلسوں میں بیٹھے اور گفتگو کرے۔ اس وقت تک میں ہر قسم کی تنگی اور ترشی برداشت کروں گی۔ لیکن نکاح نہ کروں گی، کیونکہ ان کو خیال تھا کہ ممکن ہے کہ اگر میں نکاح کر لوں تو سوتیلے باپ سے میرے بچے کو کچھ تکلیف پہنچے۔ چنانچہ حضرت انس رضؓ بعد میں اپنی ماں کے اس احسان کو نہایت شکریہ کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میری ماں نے میری محبت اور تربیت کا حق ادا کر دیا۔

جب آنحضرت مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے اس وقت انس رضؓ کی عمر دس سال کی تھی۔ ام سلیم رضؓ ان کو لے کر خدمت میں حاضر ہوئیں

اور کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اس بیٹے کو بڑی آرزوؤں سے پالا ہے اور میری دلی تمنا یہ ہے کہ یہ آپ کی خدمت گذاری کرے۔ حضور نے اس کو قبول فرمایا اور انس رض کو اپنی زندگی تک اپنی ہی خدمت میں رکھا۔ یہی حضرت انس رض بیان کرتے ہیں کہ دس سال تک میں نے رسالت مآب کی خدمت گذاری کی لیکن اتنے زمانے میں کبھی آپ نے یہ نہ فرمایا کہ انس رض تم نے ایسا کیوں کیا، یا ایسا کیوں نہ کیا اور اس عرصے میں جس قدر میں نے آپ کے کام کئے ہوں گے اس سے زیادہ آپ نے میرے کام کر دئے ہوں گے۔

ام سلیم رض جب انس رض کو حضور کی خدمت میں سپرد کر چکیں تو انھیں کے قبیلے کے ایک معزز آدمی نے جن کا نام ابو طلحہ تھا۔ نکاح کا پیغام بھیجا حضرت ام سلیم رض نے کہا کہ میں رسول اللہ پر ایمان لائی ہوں اور تو کافر ہے میں تیرے ساتھ کیوں کر نکاح کروں۔ ابو طلحہ! افسوس ہے کہ تو بت کو پوجتا ہے۔ لکڑی کے بت کو پوجتا ہے جو زمین سے اُگتا ہے اور جس کو حبشی غلام بسولے سے گھڑ کر تیار کرتا ہے۔ جو تجھکو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اور تو اس زندہ طاقت والے اللہ کو نہیں پوجتا جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمینوں پر ہے۔ ابو طلحہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ بت کو توڑ کر چولھے میں جھونکا اور آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کلمہ پڑھا اور مشرف باسلام ہوئے۔

چونکہ وہ ام سلیمؓ کے سمجھانے سے اسلام لائے تھے اس وجہ سے ان کو نہایت خوشی ہوئی۔ باوجود غربت کے بلا مہر کے ان کے ساتھ نکاح کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ چنانچہ ابوطلحہ کا اسلام ہی ان کا مہر قرار دیا گیا اور نکاح ہوگیا۔

ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام اباعمیر رکھا۔ یہ بڑا شوخ اور پیارا بچہ تھا۔

آنحضرت کبھی کبھی ابوطلحہؓ کے گھر جایا کرتے تھے۔ اباعمیر کی شوخیوں سے خوش ہوتے تھے۔ ایک دفعہ آپ تشریف لے گئے۔ ام سلیمؓ نے کچھ کھانا لاکر سامنے رکھا۔ آپ نے تناول فرمایا۔ پانی پینے کے لئے کوئی برتن نہ تھا مشکیزہ ہی سے منہ لگاکر پی لیا۔ ام سلیمؓ نے مشکیزہ کا منہ جو حضور کے دہن مبارک سے چھوگیا تھا۔ برکت کی غرض سے فوراً کاٹ کر ایک ڈبیہ میں رکھ لیا۔ اباعمیر اس دن کچھ غمزدہ معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ سست کیوں ہے۔ ام سلیمؓ نے کہا کہ اس نے ایک نغیر (مثل لال کے ایک چھوٹی سی چڑیا) پالی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ آج وہ مرگئی۔ آپ مسکرائے اور قریب بلاکے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا:۔

یا اباعمیر ما فعل النغیر۔ اے اباعمیر تیری نغیر کیا ہوئی؟ بچہ ہنس پڑا۔

بھی ابا عمیر بیمار پڑا۔ اور سخت بیمار پڑا۔ ایک دن صبح کے وقت اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ابو طلحہ رضؓ کو اس روز کوئی ضروری کام تھا مجبوراً جانا پڑا۔ ادھر لڑکا گذر گیا۔ ام سلیم رضؓ نے گھر کے لوگوں کو منع کر دیا۔ کہ ابو طلحہ رضؓ کو اس کے موت کی خبر کوئی نہ دے۔ میں خود ہی اُن سے کہوں گی۔ نہ روئیں نہ چلائیں۔ بچے کو نہلایا کفنایا اور گھر کی ایک کوٹھری میں اس کا جنازہ بند کر دیا۔

شام کو ابو طلحہ رضؓ آئے۔ آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ ام سلیم رضؓ کہا کہ جس حالت میں تم چھوڑ گئے تھے اس سے اچھی حالت میں ہے وہ سمجھے کہ اب اچھا ہے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ ام سلیم رضؓ نے کھانا لا کر رکھا۔ جب کھا پی کر فارغ ہوئے اور اطمینان سے بیٹھے تو ام سلیم رضؓ نے کہا کہ اگر ہم کو کوئی چیز عاریتاً ملے اور اس سے کچھ دن نفع اٹھائیں۔ پھر وہ واپس لی جائے تو کیا ہم کو رنج و غم کرنا چاہیئے۔ حضرت ابو طلحہ رضؓ نے کہا کہ اس پر رنج و غم کرنا حماقت ہے۔ ام سلیم رضؓ نے کہا کہ ابا عمیر بھی اللہ کی امانت تھا۔ اب واپس لے لیا گیا۔ صبر کرو۔

ابو طلحہ رضؓ نے جو یہ سنا تو کہا کہ او ہو!! ام سلیم رضؓ! تم چاہتی ہو کہ آج کی رات صبر میں۔ مجھ سے سبقت لے جاؤ۔ واللہ یہ کبھی نہ ہو گا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہم سب اللہ ہی کی امانت ہیں اور اسی کی طرف

جائیں گے یہ کہہ کر اُٹھے اور بچے کو دفن کیا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ واقعہ سُنا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس صبر کا اچھا بدلہ دے گا۔ اور اُن کے لئے برکت کی دعا مانگی۔ چنانچہ ابا عمیر کا نعم البدل ایک دوسرا بیٹا ان کو اللہ تعالیٰ نے عنایت کیا۔ جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔

یہ عبداللہؓ عرب کے شیروں میں سے ایک شیر گزرے ہیں اور اُن کی اولاد کو اللہ تعالےٰ نے بڑے بڑے رتبے دیئے۔

جنگ احد میں ام سلیمؓ مع اپنے شوہر ابوطلحہؓ کے شریک تھیں۔ ابوطلحہؓ آنحضرت کی حفاظت میں سینہ سپر رہے۔ دشمنوں کے تیر اور نیزے اپنے جگہ پر روکتے تھے۔ اور حضرت ام سلیمؓ پیاسوں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کے زخموں پر پٹی باندھتی تھیں۔

جنگ حنین میں جو بڑا بھاری معرکہ تھا باوجود اس کے کہ عبداللہ اس وقت پیٹ میں تھے موجود تھیں۔ ایک خنجر کمر سے بندھا ہوا تھا ابوطلحہؓ نے آنحضرت سے کہا کہ دیکھئے ام سلیمؓ بھی خنجر باندھ کر لڑنے کے لئے آئی ہے۔ ام سلیم بولیں کہ میں نے یہ خنجر اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کوئی کافر میرے قریب آیا تو اس کے پیٹ میں بھونک دوں گی۔ حضور مسکرائے اور فرمایا کہ انشاءاللہ یہاں تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔

ایک مرتبہ آپ ابو طلحہؓ کے گھر گئے۔ روزہ رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اس کے بعد فرمایا کہ میں نماز پڑھوں گا۔ ام سلیمؓ نے ایک کپڑے میں پانی چھڑک کر چٹائی بچھا دی۔ آپ نے نفلی نماز پڑھی۔ سلام پھیرنے کے بعد ام سلیمؓ کے گھرانے کے لئے دعا مانگنی شروع کی۔ اس وقت ام سلیمؓ نے دریائے نبوت کو جوش میں پایا۔ عرض کیا یا رسول اللہ میں سب سے زیادہ انسؓ کو چاہتی ہوں جو آپ کا خدمت گار ہے اس کے لئے خاص طور پر دعا فرمائیے۔ آپ نے دین اور دنیا کی کوئی بھلائی ایسی نہیں چھوڑی جس کی انسؓ کے لئے دعا نہ کی ہو۔ اور کہا کہ یا اللہ تو اس کو مال دے۔ اولاد دے اور اس کی عمر میں برکت عطا فرما۔

اس پاک دعا کا اثر دیکھئے۔ یہی مفلس خدمت گار انسؓ بعد میں تمام انصار سے زیادہ دولت مند ہوئے۔ اور سو سال سے زائد عمر پا کر ۹۲ سنہ ھ میں تمام صحابہ کے بعد بصرہ میں انتقال کیا۔ اولاد کا یہ حال تھا کہ ایک سو انتیس ۱۲۹ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

جب رسالت مآب حج کے لئے تمام اہل و عیال کو ساتھ لے کر مکہ کو چلے اور مدینے کے تقریباً نصف باشندے ہمراہ تھے۔ اس وقت ام سلیمؓ کے پاس سواری نہ تھی کہ وہ حج کو چلتیں۔ آپ نے ازواج مطہرات سے کہا کہ ان کو اپنے ہمراہ سوار کرا لو۔ راستے میں عورتوں کے اونٹ پیچھے رہ گئے۔ ہانکنے والے

کا نام انجشہ تھا۔ جو حضرت کے غلام تھے انھوں نے حدی خوانی شروع کی جس سے اونٹ دوڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر باوجود اس کے کہ قافلہ سے آپ آگے تھے فوراً مڑ کر تشریف لائے اور فرمایا کہ انجشہ آہستہ آہستہ شیشے ہیں شیشے !! یعنی عورتیں مثل شیشے کے نازک ہیں۔ اِن کو تکلیف نہ ہو۔

حج سے فارغ ہو کر مقام منا میں جب آپ نے موئے مبارک ترشوائے تو ام سلیم رض نے ابو طلحہ رض سے کہا کہ حجام سے ان بالوں کو مانگ لاؤ۔ برکت کے لیے حفاظت کے ساتھ ان کو ایک شیشی میں بند کر کے رکھ لیا

وفات کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا کہ حضرت عثمان رض کی خلافت کے زمانے میں انتقال فرمایا۔

عہد صحابہ میں ان کا شمار عاقل ترین عورتوں میں تھا۔

حضرت خنساءؓ

ان کا اصلی نام تماضر ہے لیکن چستی چالاکی اور حسن کی وجہ سے خنساءؓ کہی جاتی تھیں جس کے معنی ہرنی کے ہیں۔

ان کے باپ کا نام عمرو بن الحارث تھا جو قبیلہ بنی سلیم سے تھے۔

ان کی پیدائش ہجرت سے تقریباً بیالیس سال پہلے ہوئی۔ قبیلہ ہوازن کا مشہور سردار درید بن الصمۃ جو جنگ حنین میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا اس نے خنساءؓ کے باپ کے پاس نکاح کا پیغام دیا۔

خنساءؓ کے والد نے کہا کہ میں تمہاری شرافت اور سرداری سے واقف ہوں لیکن وہ لڑکی اپنا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے اس لئے میں اس سے کہوں گا۔ چنانچہ اس نے خنساءؓ سے ذکر کیا۔

اس زمانے میں اہل عرب اپنے قبیلے کے سوا کسی دوسرے قبیلے میں شادی کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ خنساءؓ نے جواب دیا کہ میں اپنے قبیلے کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے میں نکاح کرنا پسند نہیں کرتی۔ درید محروم واپس آیا۔

خنساءؓ کا نکاح پہلے رواحہ کے ساتھ ہوا جس سے ایک بیٹا عبداللہ

پیدا ہوا۔ رواحہ کے مرنے کے بعد دوسری شادی مرداس سے ہوئی۔ اس سے سراقہ، یزید، معاویہ، عمر اور ایک بیٹی عمرہ پیدا ہوئی۔

خنساءؓ کی جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ تمام شعرائے عرب کا اتفاق ہے کہ کوئی عورت عرب میں ان کے برابر شاعر نہیں ہوئی نہ اُن سے پہلے نہ اُن کے بعد۔

بشار جو عربی کا بہت بڑا شاعر گذرا ہے اس نے ایک مرتبہ کہا کہ عورتوں کے اشعار کو جب میں غور سے دیکھتا ہوں تو اُن میں ایک نہ ایک نقص یا کمزوری پاتا ہوں کسی نے پوچھا کہ کیا خنساءؓ کے اشعار کا بھی یہی حال ہے۔ اس نے کہا وہ تو مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔

جریر شاعر کہا کرتا تھا کہ اگر خنساءؓ کے اشعار نہ ہوتے تو میں دعویٰ کرتا کہ عرب میں سب سے بہتر شاعر میں ہوں۔

ان کی شاعری کا حال یہ تھا کہ ابتدا میں کبھی کبھی دو دو چار چار شعر کہا کرتی تھیں لیکن جب قبیلہ بنی اسد سے ان کے قبیلے کی لڑائی ہوئی تو اس میں اُن کا حقیقی بھائی مقتول ہو گیا اور دوسرا بھائی صخر جو صرف باپ کی طرف سے بھائی تھا زخمی ہو کر آیا۔ اس کے سینے میں ایسا برچھا لگا تھا کہ اس کا پھیپھڑا باہر نکل آیا تھا۔

خنساء کو اس کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ کیونکہ وہ نہایت عقلمند

سخی حسین اور بہادر شخص تھا۔ انھوں نے اپنے زخمی بھائی کی ایک سال تک تیمارداری کی لیکن وہ اچھا نہ ہوا اور آخر اسی زخم سے ہلاک ہو گیا۔

اس کی موت سے خنساءؓ کو بے حد رنج و غم ہوا۔ اسی وقت سے انھوں نے صخر کے مرثیے کہنے شروع کئے۔ اور ایسے کہے کہ جن کو سن کر لوگ بیتاب ہو جاتے تھے۔ انھیں مرثیوں سے تمام عرب میں اُن کا شہرہ ہو گیا۔

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب مختلف مقامات پر مجلس منعقد کیا کرتے تھے جن کو بجائے مجلس کے میلہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ ان میں خرید فروخت کی بھی گرم بازاری رہتی تھی۔ اگرچہ ان کا اصلی مقصد تبادلہ خیالات اور شعر گوئی ہوتا تھا۔

ان میں مرد اور عورتیں یکساں حصہ لیتے تھے۔ ان کی ابتدا ربیع الاول سے ہوتی تھی۔ یعنی ابتدائے موسم بہار سے تمام لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر انھیں میلوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ غرہ ربیع الاول میں پہلا میلہ دومۃ الجندل میں لگتا۔ اس کے بعد وہاں سے ہجر کے بازار میں آتا پھر عمان کو جاتا۔ وہاں سے حضر موت کو روانہ ہوتا۔ پھر صنعاء یمن میں پہنچتا تھا کسی مقام میں دس روز کسی میں بیس روز قیام رہتا تھا۔ اس طرح پر تمام ملک میں گشت لگانے کے بعد ذیقعدہ کے مہینے میں حج کے قریب آخری میلہ بازار عکاظ میں لگتا تھا جو مکے سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔

بیس روز تک یہاں بڑی گرم بازاری رہتی تھی۔ عرب کے تمام قبائل اور ان کے سردار لازمی طور پر جمع ہوتے تھے۔ اگر کوئی سردار کسی مجبوری سے نہیں آسکتا تھا تو اپنا قائم مقام بھیجتا تھا۔

اسی مقام سے اہل عرب کے تمام امور سرانجام پاتے تھے سردار یہیں پر مقرر کئے جاتے تھے۔ قبیلوں کے باہمی خون اور لڑائیوں کا فیصلہ یہیں ہوتا تھا اور چونکہ اس بازار پر قریش کی عظمت تھی اس لئے تمام عرب میں ممتاز تھے اور گویا ایک حیثیت سے حکومت کا اقتدار ان کو حاصل تھا۔

جب تمام جھگڑے اور معاملات ختم ہو چکتے تو ہر قبیلہ کے شاعر جمع ہوتے اور اپنی بہادری فیاضی، باپ دادا کے کارنامے۔ شکار و خونریزی کی کیفیت فخریہ بیان کرتے۔ جو لوگ مقرر ہوتے وہ تقریر کرتے تھے۔ یہاں ہر ایک شاعر اور مقرر کا درجہ مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ بازار گویا اہل عرب کی لیاقت کے امتحان کا مقام تھا، جو جس قابل ہوتا مان لیا جاتا، اور تمام عرب میں اس کی شہرت ہو جاتی۔

خنساءؓ کے مرثیے یہاں بھی لاجواب تسلیم کر لئے گئے تھے اور جب وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آتیں تو تمام شعراء ان کے گرد حلقہ باندھ لیتے، اور منتظر رہتے کہ ان کے اشعار سنیں پھر وہ اپنے مرثیے سناتیں۔

نابغہ ذبیانی جو عرب میں سب سے مشہور اور ممتاز شاعر تھا اور بازار عکاظ میں سوائے اس کے کوئی سرخ خیمہ نہیں لگا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ عزت تھی جو صرف اسی شخص کا حق ہوتی تھی۔ جو شاعری میں مسلم الثبوت استاد مان لیا جائے۔ اس نے جب خنساءؓ کے مرثیے سُنے تو کہا کہ تو سب سے بہتر شاعر ہے۔

حضرت حسانؓ جو بعد میں دربار نبوت کے شاعر ہوئے نابغہ کے اس فیصلے سے ناراض ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم نے غلط فیصلہ کیا خنساءؓ سے بہتر میرے اشعار ہیں۔ نابغہ نے خنساءؓ کی طرف اشارہ کر دیا انھوں نے حسان سے پوچھا کہ آپ کا سب سے بہتر شعر کون سا ہے اس کو سنایئے انھوں نے سنایا۔ اس شعر پر فوراً آٹھ اعتراض کر دیئے جن میں سے ایک کا بھی انھوں نے جواب نہ دیا، اور بالکل ساکت رہ گئے۔

الغرض شاعری کے لحاظ سے خنساءؓ طبقہ دوم کے شعراء عرب میں سب سے بلند ہیں۔ ان کا دیوان دیگر شاعروں میں بہت مقبول ہے، اور وہ قدیمی شاعری کا ایک بیش بہا ہیرا سمجھا جاتا ہے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو خوش قسمت خنساءؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور اسلام لائیں۔ حضور نے اُن کے اشعار سنے اور اُن کی فصاحت و بلاغت کی داد دی۔

خنساءؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھی اکثر جاکر بیٹھتی تھیں وہ بھی ان کے اشعار سُنا کرتی تھیں۔

اُن کے سر پر بالوں کا ایک سربند پڑا ہوا تھا جو عرب میں سخت غم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ایسا سربند منع ہے۔ خنساءؓ نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا مگر میں اس کو جو پہنتی ہوں تو اس کا ایک خاص سبب ہے۔ انھوں نے دریافت فرمایا۔ کہا کہ بات یہ ہے کہ میرے باپ نے جس شخص کے ساتھ میرا نکاح کر دیا تھا وہ بہت فضول خرچ آدمی تھا۔ اس نے اپنی اور میری تمام دولت صرف کر ڈالی۔ جب میں محتاج ہوگئی تو میرے بھائی صخر نے اپنے مال کے دو حصے کئے ان میں سے اچھا حصہ مجھکو دیا۔ میرے شوہر نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کو بھی تلف کر ڈالا۔ پھر صخر نے اپنے باقی مال کے دو حصے کئے اور جو عمدہ تھا منتخب کر کے مجھے دیا۔ اس کی بیوی نے اُس سے کہا کہ خنساءؓ کو ایک تو تم اپنا آدھا مال دیتے ہو وہ بھی اچھا چھانٹ کر۔ اس نے کہا کہ ہاں کیونکہ میری موت کے بعد وہی مجھکو یاد رکھے گی۔

سو اسی کی یادگار میں میں نے اس کو پہنا ہے۔

قادسیہ کی لڑائی جو ۱۶ھ میں ہوئی جس میں ایرانیوں نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اس میں خنساءؓ مع اپنے چار بیٹوں کے

موجود تھیں۔ رات کے وقت انھوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور یہ تقریر کی۔

"اے میرے بیٹو! تم اپنی خوشی سے اسلام لائے اور اپنی رضامندی سے تم نے ہجرت کی۔ قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے کہ جس طرح تم اپنے ماں کے شکم سے پیدا ہوئے اسی طرح تم اپنے باپ کے سچے فرزند ہو۔ تمھارا نسب بے داغ ہے اور تمھارے حسب میں کوئی نقص نہیں ہے۔

تم سمجھ لو کہ عقبیٰ جاودانی کے مقابلے میں یہ دنیائے فانی ہیچ ہے صبر کرو اور صبر دلاؤ۔ متحد رہو اور اللہ سے ڈرو۔ کیا عجب ہے کہ نجات پاؤ۔

جب تم دیکھو کہ لڑائی جوش پر آئی اور اس کے شعلے بھڑکنے لگے تو بیچ میں کود پڑنا اور بیدریغ تیغ زنی کرنا۔ عالم آخرت کی بزرگی اور فضیلت پر کامیاب ہو جاؤ گے۔

صبح کو جب لڑائی شروع ہوئی تو وہ فرماں بردار بیٹے اپنی ماں کے حکم کے مطابق میدان جنگ میں کود پڑے اور سب کے سب درجہ شہادت پر کامیاب ہوئے۔ خنساء نے سنا تو کہا کہ

"اللہ کا شکر ہے کہ ان کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں ان سے اس مقام پر ملوں گی جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ان کے سروں پر ہوگا۔"

حضرت عمرؓ نے اُن کے بیٹوں کی تنخواہ جو فی کس دو ہزار درہم سالانہ تھی ان کے نام کر دی۔

خنساءؓ نے سنہ ۲۴ھ میں چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

صالحات

مقالات

حضرت خولہؓ

حضرت خولہؓ کے باپ کا نام ازور تھا۔ وہ صحابہ میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے سامنے ہی شہید ہوگئے تھے۔ حضرت خولہؓ اور اُن کے بھائی ضرار یہ دونوں بھی اپنے باپ کی طرح جامِ شہادت پینے کے مشتاق تھے۔ اسی غرض کے لئے شام اور مصر کے فتوحات میں یہ دونوں بھائی بہن برابر کے شریک رہے۔ اُن کی بوڑھی ماں مدینہ شریف میں اکیلی رہتی تھیں۔

حضرت خالدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ ان دونوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ان میں غیر معمولی جرأت اور بہادری تھی اور تمام فوج کے سپاہیوں میں ہر دل عزیز تھے۔

بھائی اور بہن دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ بہن کی رگوں

میں جو خون گردش کرتا ہے اس کا ایک ایک قطرہ بھائی کی محبت میں سرشار ہوتا ہے۔ وہ خون نہیں ہے بلکہ آسمانی پاک محبت کی شراب ہے جو بہن کو ہر وقت بھائی کی محبت کے نشے میں رکھتی ہے۔ بہن کو بھائی کی کس قدر محبت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف بہنیں ہی کر سکتی ہیں، بھائی نہیں کر سکتے بہنو کا خون نازک اور لطیف ہوتا ہے۔ محبت اس کی ایک ایک ذرہ میں سمائی ہوتی ہے۔ لیکن بھائی کے خون میں مردانگی ہے۔ وہ سخت ہوتا ہے وہ بہن کی محبت میں اتنا نہیں پگھلتا جتنا بہن کا خون بھائی کی محبت میں۔

لیکن بہادر انسان کی خاص صفت یہ بھی ہے کہ رقت اور محبت کا اس کے دل میں زیادہ مادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت خولہ رح جس قدر حضرت ضرار رح کو عزیز رکھتی تھیں۔ حضرت ضرار رح اس سے کم ان کو نہیں سمجھتے تھے یہ بھی اتفاقات کے عجائبات میں سے ہے کہ شام اور مصر کی فتوحات میں یہ دونوں بھائی بہن جابجا کافروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے ہیں لیکن ایک دوسرے کو جب تک چھڑا نہ لیتا اس کو چین نہ آتا تھا۔ اس موقع پر ہم ان کی چند گرفتاریوں کا حال لکھتے ہیں۔

سنہ ۱۳ھ میں مسلمانوں کا لشکر دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھا کہ ناگہاں یہ خبر آئی کہ اجنادین میں کافروں کا بڑا مجمع ہو رہا ہے۔ حضرت

خالد بن ولید رضؓ نے حضرت ابو عبیدہ رضؓ سے کہا کہ آپ ضرار رضؓ کو اُن کے مقابلے کے لئے بھیجئے۔ اُنھوں نے اس رائے کو پسند کیا اور پانچ ہزار سوار ضرار رضؓ کو دے کر اس طرف روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ راستے میں حمص کے بادشاہ وردان سے مقابلہ ہو گیا جو بارہ ہزار فوج لئے ہوئے اجنادین کو جا رہا تھا۔ ضرار نے بڑی بہادری سے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ فوج کے اندر گھس گئے۔ وردان کا بیٹا ہمدان بھی اس فوج میں سردار تھا۔ اس نے ضرار رضؓ کو ایک نیزہ مارا جس سے ان کا بازو زخمی ہوا انھوں نے لپک کر اس کے سینے میں نیزہ جڑا۔ جو پار ہو کر اس کی پیٹھ کی ہڈی سے گذر گیا۔ جب نیزہ کھینچا تو اس کا پھل اس کی ہڈی میں پھنسا رہ گیا۔ کفار کو موقع ملا چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ضرار کو گرفتار کر لیا۔

مسلمان سپاہی باوجود اپنے سردار کی گرفتاری کے نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے۔ ایک تیز رفتار سوار نے ضرار رضؓ کی گرفتاری کی خبر حضرت خالد رضؓ کو پہنچائی۔ اُنھوں نے حضرت ابو عبیدہ رضؓ سے اجازت لے کر ایک ہزار سواروں کو اپنے ساتھ لیا اور باگ چھوڑ دی خالد رضؓ تیزی سے ایک ہزار سواروں کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک انھوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے ایک نہایت تیز رفتار سوار جا رہا ہے جو ڈھاٹا باندھے ہوئے ہے اور ہاتھ میں ایک لمبا

نیزہ لئے ہوئے ہے۔ اس کے بدن پر سیاہ لباس ہے اور سوائے آنکھوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔

حضرت خالدؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون سوار ہے لیکن کسی نے کچھ نہ بتایا۔ آخر انھوں نے گھوڑے کو تیزی سے اس کی طرف بڑھایا اور تمام لوگوں نے اپنے گھوڑے تیز کئے تاکہ معلوم کریں کہ کون شخص ہے لیکن وہ آگے نکل گیا یہاں تک کہ معرکہ میں پہنچ کر اس نے کافروں پر بیدریغ حملہ کیا۔ وہ رومیوں کی جماعت میں گھس جاتا تھا اور پھر بجلی کی طرح نکل آتا تھا۔ پھر حملہ کرتا تھا اور پھر باہر آتا تھا۔ یہاں تک کہ کفار کے خون سے اس کا نیزہ سرخ ہو گیا۔ اور کئی رومیوں کو اس نے پست کر دیا۔ پھر وہ قلب کی طرف بڑھا اور رومیوں کی فوج کو چیرتا ہوا بیچ میں پہنچا اور کافروں کو قتل کیا۔ اتنے میں حضرت خالدؓ بھی پہنچ گئے اور انھوں نے بھی کافروں پر حملہ کیا رومیوں نے بڑی بہادری سے ان کے حملے کو روکا دوپہر تک لڑتے رہے۔ لیکن آخرکار شکست کھا کر بھاگے ان کا زیادہ حصہ قتل ہو گیا۔

لڑائی کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ سوار خون میں بالکل ڈوبا ہوا ہے چاروں طرف سے مسلمانوں نے تحسین کی۔ حضرت رافعؓ نے خالدؓ سے کہا کہ میں تو حیران ہوں کہ یہ کون سوار ہے۔ ایسا بہادر سوار کم دیکھنے میں آیا۔

حضرت خالدؓ نے کہا علیٰ ہٰذا میں بھی حیرت میں ہوں۔ ذرا دریافت کرو کہ یہ کون ہے۔ ایک شخص نے بڑھ کر دریافت کیا لیکن اس سوار نے منہ پھیر لیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے کہا اے بہادر شہسوار امیر تیرا نام دریافت چاہتا ہے اور تو منہ پھیرتا ہے۔ یہ دیکھکر حضرت خالدؓ خود آگے بڑھے اور پوچھا۔ تو اس نے کہا کہ اے امیر! میں نے اسی وجہ سے منہ پھیرا کہ مجھے شرم آئی کیونکہ میں عورت ہوں اور آپ سب لوگ مرد ہیں۔ میں ازور کی بیٹی ہوں اپنے بھائی کے قید ہو جانے کی خبر سن کر تاب نہ لا سکی اور اس کو چھڑانے کے لیے چلی آئی۔

خولہؓ نے ایک ایک مسلمان سے پوچھا کہ کہیں ضرار کو بھی تم نے دیکھا لیکن کسی سے کچھ پتہ نہ معلوم ہوا۔ تب ان کے دل کو بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے رونا شروع کیا۔

"اے میرے بھائی! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کس میدان میں کافروں نے تجکو پھینکا۔ انھوں نے تجھے نیزے سے مارا یا تلوار سے قتل کیا......

اے میرے بھائی تیری بہن تیرے اوپر قربان۔ اگر میں تجھے دیکھ پاتی تو کافروں کے ہاتھ سے خود چھڑاتی۔ کیا خبر ہے کہ میں اب پھر تیرا دیدار دیکھوں گی یا نہیں یا تو اپنے باپ کے پاس پہنچا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہادت کا جام پیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو میری طرف

ے تجھ پر ہزار ہزار سلام ہوں۔

اُن کا یہ نوحہ سُن کر تمام لوگ حتٰی کہ حضرت خالدؓ بھی رونے لگے۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا دستہ رومیوں کا پہاڑ کے دامن میں نمودار ہوا۔ مسلمانوں نے فوراً تیار ہو کر اُن پر حملہ کیا۔ اُنھوں نے دیکھتے ہی تلواریں اور نیزے اپنے ہاتھوں سے پھینک دیئے اور اماں مانگی۔ حضرت خالد نے ان کو اماں دی اور پوچھا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم حمص کے باشندے ہیں۔ وردان کے ساتھ تمھارے مقابلے کے لئے آئے تھے لیکن یہاں آکر ہم کو معلوم ہو گیا کہ وہ تم سے نہیں لڑ سکتا۔ اس لئے ہم اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے اُن سے پوچھا کہ کیا تم کو ہمارے بھائی کی کچھ خبر ہے۔ جس نے وردان کے بیٹے کو ہلاک کیا تھا اور جس کو اس نے گرفتار کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ وہی جو بلا زرہ پہنے ہوئے لڑتا تھا۔ حضرت خالدؓ نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ وردان نے اس کو سو سواروں کی حراست میں قید کر کے حمص کی طرف روانہ کیا ہے، تاکہ وہاں سے ہرقل بادشاہ روم کے پاس بھیجا جائے۔

حضرت خالدؓ کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔ انھوں نے فوراً حضرت رافعؓ کو حکم دیا کہ سو سوار لے کر حمص کے راستے کی طرف جاؤ اور دشمنوں کے نشان قدم سے ان کا پتہ لگا کر ضرار کو چھڑا لاؤ۔

رافع رضؓ نے اسی وقت سو سوار منتخب کیے اور لے کر روانہ ہو گئے۔ حضرت خولہؓ کو جب یہ خبر ملی تو خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھا، گھوڑے پر سوار ہو کر ساتھ ہو لیں۔

حضرت رافعؓ اس دستہ فوج کو لے کر بہت دور نکل گئے۔ دشمنوں کے نقش قدم کا ہر چند انھوں نے کھوج لگایا لیکن پتہ نہ چلا۔ دور تک تلاش کرتے ہوئے چلے گئے۔ بالآخر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ ابھی یہاں تک نہیں آئے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ ہم لوگ گھات میں چھپ کر بیٹھ رہیں اور ان کے آنے کا انتظار کریں۔

انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ یہاں تک مسلمانوں کو خیال گزرنے لگا کہ ہم نے وقت کو رائگاں کھویا کہ اتنے میں کچھ سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب قریب آ گئے تو معلوم ہوا کہ یہ وہی سو سوار ہیں جو ضرارؓ کو لئے جا رہے ہیں۔ جب ٹھیک موقع پر آ گئے تو یکایک حضرت رافعؓ نے حملہ کیا۔ تکبیر کا نعرہ سنتے ہی کافروں کے ہوش اڑ گئے۔ حضرت ضرار چھڑا لئے گئے اور کافر ایک ایک کر کے مارے گئے۔

دمشق ہی کے محاصرہ میں یہ خبر آئی کہ اجنادین میں نوے ہزار عیسائی فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جمع ہوئی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے

تمام فوج کو اجنادین کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت خالد کو فوج کے ہمراہ روانہ کیا، اور عورتوں اور بچوں سامان وغیرہ کو پیچھے سے خود ایک ہزار سواروں کی حفاظت میں لے کر روانہ ہوئے۔ ابھی ایک منزل آئے تھے کہ والی دمشق نے موقع پا کر چھ ہزار سوار لے کر حضرت ابو عبیدہؓ پر شہر سے نکل کر حملہ کر دیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ عربی عورتیں جان توڑ کر لڑیں لیکن کفار کی تعداد بہت تھی۔ بہت سی مسلمان عورتیں گرفتار ہو گئیں۔ منجملہ اُن کے حضرت خولہ بھی تھیں۔

ایک تیز رفتار سوار خالد کے پاس پہنچا، اور چلایا کہ کفار نے عربی حرم پر چھاپہ مارا اور ایسی جمعیت سے آئے ہیں کہ ابو عبیدہؓ کو مقابلہ کی طاقت نہیں معلوم ہوتی حضرت خالدؓ نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن جو بات ہونے والی ہوتی ہے ہو کر رہتی ہے۔ میں حضرت ابو عبیدہؓ سے کہتا تھا کہ آپ فوج لے کر چلیں اور ساقہ پر مجھے چھوڑیں۔ لیکن انھوں نے نہ مانا۔ فوراً دو ہزار سوار اُن کی امداد کے لئے روانہ کئے اور ایک ہزار اپنے ہمراہ لے کر پیچھے سے چلے۔ کفار اُن کو دیکھتے ہی بھاگے لیکن ان کا سردار بولص اور بہت سے عیسائی گرفتار کر لئے گئے۔

حضرت ضرارؓ نے جب یہ سنا کہ کفار جن عورتوں کو قید کر لئے گئے ہیں اُن میں ان کی بہن خولہ بھی ہیں تو رنج سے بے قرار ہو کر رونے لگے۔

حضرت خالدؓ نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اُن کے بہت سے سرداروں کو تم نے گرفتار کیا ہے۔ ان کے عوض میں ہم اپنے قیدیوں کو چھڑا لیں گے۔ تمام سپاہ کو مع حضرت ابو عبیدہؓ کے انھوں نے فوج کی طرف روانہ کیا اور خود ایک ہزار سوار لے کر اپنے قیدیوں کو چھڑانے چلے۔ ان ہزار سواروں میں حضرت رافعؓ اور ضرارؓ بھی تھے۔

ادھر بولص کا بھائی پطرس جب مسلمان عورتوں کو قید کرکے لے گیا تو وہ ایک ندی کے کنارے فروکش ہوا۔ باقی ماندہ سپاہ اس کے ساتھ تھی۔ اس نے کہا کہ جب تک میرے بھائی کی کوئی خبر نہ معلوم ہو اس وقت تک یہیں ٹھہرو تاکہ اس کا کچھ سراغ لگا کر اس کے چھڑانے کی کوئی تدبیر کریں۔

اس نے مسلمان عورتوں کو ایک محفوظ خیمہ میں بند کیا۔ یہ عورتیں اکثر بوڑھیاں تھیں۔ لیکن سواری اور جنگ میں ماہر تھیں۔ انھوں نے آپس میں گفتگو شروع کی کہ اب کس تدبیر سے ہم کو نجات مل سکتی ہے۔ حضرت خولہؓ جو نوعمر اور پرجوش تھیں بولیں کہ اے تبابعہ اور عمالقہ (عرب کے دو پرانے شاہی خاندان) کی بیٹیو! کیا تم پسند کرتی ہو کہ ان کافروں کے بس میں ہو کر رہو اور تمھاری اولاد ان کی غلام بنے۔ کیا تم اس ذلّت کو برداشت کرو گی کہ عرب کے قبائل تمھاری اس رسوائی کا چرچا کریں

کہاں ہے تمھاری آبائی شجاعت! کدھر ہے تمھاری خاندانی شہامت! تمھارے اسلاف ہمیشہ موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتے رہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ تم سب بھی اس رسوائی کے بدلے مرنا قبول کرو گی۔ حضرت خولہ کی یہ تقریر سُن کر ایک صحابیہ نے کہا کہ اے خولہ بیشک ہم ایسے ہی ہیں۔ اور بارہا ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہماری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو ہمارے اسلاف کی رگوں میں تھا سخت سے سخت جنگوں میں اپنی شجاعت اور شہامت ہم دکھلا چکے ہیں۔ مگر اس موقع پر جبکہ تلوار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے کیا کر سکتے ہیں۔

حضرت خولہ رض نے کہا کہ تلوار نہ ہو تو نہ سہی۔ خیمے کی چوبیں نکال لو میخیں اُکھیڑ لو اور ان کو لے کر غارت گروں پر حملہ کرو۔

سب عورتوں نے ایسا ہی کیا اور غول بندی کر کے ایک دائرہ بنا لیا حضرت خولہ ان کی سردار تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ سب ایک سے ایک ملی رہو الگ نہ ہو۔ مقابلہ کرنے والوں کی تلواروں اور نیزوں کو توڑ ڈالو۔

اس شکل سے یہ غول باہر نکلا۔ وہاں ایک رومی کھڑا تھا۔ پہلے اسی پر ایک صحابیہ نے ایک چوب ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور وہیں مر گیا۔ دیکھتے ہی چاروں طرف سے رومی دوڑے۔ پیٹر کو بھی خبر ہوئی بھاگتا ہوا آیا۔ عورتوں کو اس طرح دیکھ کر ہنسا اور پوچھا کہ اس سے تمھارا کیا

مطلب ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم رسوائی اور بدنامی کی زندگی سے بچنے کے لئے تم سے لڑیں گے۔ مرجائیں گے لیکن تمھارے ہاتھوں میں قیدی بن کر نہ رہیں گے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ عورتوں کو پکڑ لو ان پر تلوار نہ اُٹھاؤ بلکہ زندہ گرفتار کرو۔ سپاہی چاروں طرف سے لپکے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان شیردل عورتوں نے کئی کافروں کو جان سے مارڈالا۔ تب بیٹر کو غصہ آیا وہ اپنے گھوڑے پر سے کود پڑا۔ اور سپاہیوں کو للکارا کہ اب تلوار اٹھاؤ اور اُن کو قتل کرو۔ یہ سنتے ہی رومی تلواریں کھینچ کھینچ کر آگے بڑھے۔

یہ وقت ان عورتوں کی سخت مایوسی کا تھا۔ وہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھوچکی تھیں۔ مگر اللہ تعالےٰ بڑا مسبب الاسباب ہے رومیوں کے حملہ کرتے ہی پہاڑ کے درہ سے حضرت خالدؓ اور ضرارؓ مع ایک ہزار سواروں کے نمودار ہوگئے۔ حضرت خولہ نے للکار کر کہا کہ اے ایمان والیو شریفوں کی موت مرو اور کمینوں کی طرح عاجز و خوار نہ ہو۔ دیکھو وہ اللہ تعالےٰ کی مدد ہمارے لئے آرہی ہے۔ عورتیں امداد غیبی کو دیکھ کر خوشی کے مارے اچھل پڑیں۔ کفار دہشت زدہ ہوگئے اور بھاگنے لگے۔

بیٹر بھی اپنے گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے لپکا اور عورتوں سے بولا کہ جاؤ تم سب کو میں نے صلیب کے صدقے میں آزاد کردیا۔

ابھی وہ گھوڑے پر بھی نہیں بیٹھ چکا تھا کہ حضرت ضرار وہاں پہنچ گئے پیٹر نے بھاگتے ہوئے کہا کہ یہ عورتیں میں نے تم کو بخشیں۔ انھوں نے تیزی سے اس کی طرف گھوڑا بڑھایا اور کہا کہ اس کا کچھ شکر یہ بھی لیتے جایئے یکایک پیٹر کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی وہ گرنے لگا تتنے میں حضرت ضرار نے اس کے کولھے میں ایک نیزہ جڑا جو پار نکل گیا۔ انھوں نے اس کا سر کاٹ کر نیزہ پر رکھ لیا جس قدر کافر ملے مارے گئے اور عورتیں چھڑا لی گئیں پھر فوج اجنادین کو روانہ ہوئی۔

جنگ یرموک سب سے بڑا معرکہ ہوا ہے۔ اس میں تمام عیسائی طاقت تقریباً چھ لاکھ فوج جمع ہوئی تھی۔ اس کا افسر اعلیٰ ماہان تھا۔ اسلامی فوج چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی۔ اس کے امیر حضرت ابو عبیدہ تھے پہلے مقابلے میں حضرت خالدؓ نے تھوڑے مسلمان لے کر ساٹھ ہزار عیسائیوں کو شکست دی لیکن ان منتخب مسلمانوں میں سے پانچ آدمی گرفتار ہو گئے جن میں حضرت ضرار بھی تھے۔ حضرت خولہ اس رنج سے بے قرار ہو گئیں۔ بھائی اور کیسا بھائی۔ دن بھر اسی کی فکر۔ رات بھر اسی کی رہائی کی دعا۔ طے کر لیا کہ میں بھی اسی معرکے میں انشاء اللہ جام شہادت پیوں گی

اتفاق سے حضرت خالد کو ماہان نے صلح کی گفتگو کرنے کو بلا بھیجا

وہ سو سواروں کو اپنے ہمراہ لے کر تشریف لے گئے۔ اس نے بڑا عالیشان دربار سجا رکھا تھا کہ عربوں پر رعب غالب ہو لیکن صحابہ کی نگاہ میں دنیا کی کیا ہستی تھی جو اس کر و فر کو وہ خاطر میں لاتے۔ بہت عرصے تک گفتگو رہی۔ لیکن صلح کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ ماہان نے جھنجلا کر کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہے۔ حضرت خالد کو اس کا جھنجلانا ناگوار ہوا انھوں نے کہا کہ تم ہم سے زیادہ میدان جنگ کے شائق نہیں ہو وہ وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ جب کہ تیرے گلے میں رسی باندھ کر میں حضرت عمر رضؓ کے سامنے لے جاؤں گا اور وہاں تیرا سر اڑا دیا جائے گا۔

یہ سن کر ماہان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کے درباری منتظر تھے کہ اگر ہم کو حکم دے تو ہم خالد رضؓ کو قتل کر ڈالیں۔ ماہان نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ ابھی ان پانچ قیدیوں کو منگا کر میں تمہارے سامنے ان کی گردن اڑاتا ہوں۔ تاکہ تمھیں اپنی ہستی معلوم ہو جائے۔

حضرت خالد نے بگڑ کر کہا کہ تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ تیری کیا مجال ہے جو کسی مسلمان کا ایک قطرہ خون بھی بہائے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اور اُن کے تمام ساتھیوں نے تلوار کھینچی اور کہا کہ ابھی ہم تجھکو اور تیرے درباریوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے۔

حضرت خالد رضؓ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ماہان دل میں ڈر گیا

ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ اے خالد ٹھہرو۔ یہ سب باتیں تم نے اس لئے کہیں کہ تم سفیر ہو اور جانتے ہو کہ سفیر قتل نہیں کیا جاتا۔ اچھا اب تم اپنے لشکر میں جاؤ جس کو اللہ چاہے گا فتح دے گا۔

یہ نرم جواب سن کر حضرت خالد نے تلوار میان میں رکھ لی اور پوچھا کہ ان پانچ قیدیوں کی بابت کیا کہتے ہو۔ ماہان نے کہا میں نے آپ کی خاطر سے ان کو رہا کیا۔ آپ اپنے ساتھ لے جائیے۔ حضرت خالدؓ کو اپنے ساتھ لائے۔ خولہؓ اپنے بھائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اور اللہ تعالےٰ کا شکریہ ادا کیا۔

یرموک کی لڑائی میں مسلمان عورتیں اسلامی فوج کے پس پشت ایک ٹیلہ پر تھیں۔ کفار کی کثرت سے کبھی مسلمانوں کا میمنہ شکست کھاتا تھا کبھی میسرہ۔ اس طوفان اور شورش میں مسلمان بعض وقت شکست کھا کر بھاگ نکلتے تھے۔ عورتیں ٹیلے پر سے اتر کر ان کو روکتی تھیں۔ اور جبراً دشمنوں کی طرف پلٹاتی تھیں۔ کئی ہفتہ تک یہ لڑائی جاری رہی اور روزانہ اس قسم کی کیفیتیں پیش آتی تھیں۔ بعض وقت کفار دھکا پیل کرتے ہوئے ٹیلے تک پہنچ جاتے تھے تو مسلمان عورتیں دست بدست ان سے جنگ کرتی تھیں۔ ایک دن نہایت سخت معرکہ ہوا۔ کافر بڑھتے بڑھتے اس ٹیلے

تک پہنچ گئے۔ عورتوں نے ان سے لڑنا شروع کیا لخم اور جذام کی عورتوں نے شکست کھائی اور بھاگ نکلیں۔ حضرت خولہؓ نے ان کو ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور کہا کہ تم ہماری جماعت سے نکل جاؤ تم ہم کو بزدل اور کمزور بناتی ہو۔ آخر ان بے چاریوں نے قسم کھائی کہ اچھا اب ہم مر جائیں گے لیکن نہ ٹلیں گے۔

حضرت خولہ نے ایک رومی کافر پر وار کیا۔ لیکن اس کی تلوار ان کے سر پر پڑی اور یہ زخمی ہو کر گر پڑیں۔ تمام جسم خون سے شرابور ہو گیا حضرت عفرہ نے اس کافر کو قتل کیا اور ان کو اٹھا کر خیمہ میں لے گئیں۔ پانی پلایا آنکھیں کھلیں تو پوچھا کہ کیسا حال ہے کہا کہ اللہ کا شکر ہے، لیکن بچتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ کیا میرے بھائی ضرار کی تم کو خبر ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کئی روز سے ان کی کوئی خبر نہیں پائی۔ حضرت خولہ نے رو کر دعا کی کہ اے اللہ میرے بھائی کو اسلام کی خدمت کے لئے محفوظ رکھنا میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت عفرہؓ کہتی ہیں کہ خولہ کو اسی حال میں چھوڑ کر میں پھر لڑنے کے لئے نکلی رات کو جب مسلمان تھک کر آئے تو میں نے دیکھا کہ خولہ مشک لادے ہوئے ان کو پانی پلاتی پھرتی ہیں گویا کبھی ان کو کوئی زخم ہی نہیں لگا تھا اتنے میں حضرت ضرار بھی آ گئے پوچھا کہ کیا گذری۔ انھوں نے کہا کہ

خیر گذری۔ ایک کافر نے مجھے تلوار ماری۔ عفرہ نے اس کی گردن کاٹ لی۔
حضرت ضرار نے کہا کہ تجھے خوش خبری ہو کہ یہ تیرے لئے ذخیرہ ہے جنت کا۔

الطاکیہ میں سخت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک ایک ہزار فوج کا دستہ ایک ایک مسلمان سردار کے پاس تھا۔ حضرت ضرار بھی ایک دستہ کے امیر تھے۔ خولہ کو کسی نے خبر پہنچائی کہ ضرار شہید ہو گئے۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر مردانہ لباس پہن کر رن میں کود پڑیں۔ اتفاق سے لڑتے لڑتے وہاں پہنچ گئیں جہاں حضرت ضرار تھے۔ ان کو زندہ دیکھ کر خوش ہو کر ان کی طرف لپکیں، اور کچھ بات کرنی چاہی۔ انھوں نے بھی ان کو پہچانا اور کہا کہ اے خولہ یہ وقت بات چیت کا نہیں ہے بلکہ کام کا ہے۔ اپنے گھوڑے کی باگ میرے گھوڑے سے ملاؤ۔ اور اپنا نیزہ میرے نیزے کے برابر رکھو اگر ہم میں سے کوئی قتل ہوا تو حشر میں حوضِ کوثر پر ملاقات ہوگی۔
تھوڑی دیر کے بعد مشرکوں نے شکست کھائی۔

ملک شام فتح ہو چکا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ اردن کے قریب خیمہ زن ہیں۔ عمرو بن العاص رضؓ اور خالد رضؓ وغیرہ مصر کی فتح میں مشغول ہیں حضرت ضرار بیمار ہیں۔ ان کی بہن خولہ ان کی تیمارداری میں مشغول ہیں

وہ رملہ کے ساحل پر جہاں گھاس چارہ بہت تھا۔ دو ہزار فوج کے ساتھ ٹھیرے ہوئے تھے، تاکہ گھوڑے اور فوج پھر تازہ دم ہو جائیں۔

اسکندریہ کی چند جنگی کشتیاں اتفاقاً ایک رات اِدھر آنکلیں اُنھوں نے دیکھا کہ جابجا آگ روشن ہے، اور ملاحوں کے ذریعے سے معلوم کیا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک جماعت ٹھہری ہوئی ہے۔ تو انھوں نے اچانک چھاپہ مارا۔ کچھ مسلمان مقتول ہوئے۔ باقی ماندہ ڈیڑھ ہزار کو انھوں نے قید کر کے کشتیوں پر لاد لیا۔ انھیں قیدیوں میں یہ دونوں بھائی بہن تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ ضرار کی عیادت کو آئے تھے۔ وہ کسی صورت سے بچ نکلے اور آکر حضرت ابوعبیدہ سالارِ فوج کو خبر کی۔ ان کو بڑا رنج ہوا خاص کر ضرار اور خولہ کے قید ہونے کا۔ کیونکہ شجاعت کی وجہ سے یہ دونوں تمام فوج میں ہر دلعزیز تھے۔ انھوں نے فوراً عمرو بن العاص کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور لکھا کہ جس طرح ہو ان قیدیوں کو چھڑانے کی کوشش کرو۔ عمرو بن العاص اور خالد کو ضرار اور ان کی بہن کے قید ہونے کا بڑا غم ہوا۔ اُنھوں نے فوراً خبر کے لئے اسکندریہ میں جاسوس روانہ کے

اِدھر یہ سب قیدی اسکندریہ میں لے جاکر مقوقس کے بیٹے کے سامنے پیش کر دئے گئے۔ اس نے حکم دیا کہ سب کو قتل کر ڈالو مگر

بعض مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کا قتل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس وقت ہم میں اور عربوں میں لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے آدمی بھی اُن کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائیں اس وقت ہم اُن قیدیوں کو دے کر اُن کے عوض میں اپنے قیدی چھڑا لیں گے۔ اس کو بادشاہ نے پسند کیا اور یہ قرار پایا کہ یہ قیدی دیر زجاج میں جو اسکندریہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے رکھے جائیں۔ دوسرے دن دو ہزار فوج کی حراست میں وہ دیر زجاج کو روانہ کئے گئے۔ یہ سب خبریں حضرت خالد کو پہنچیں۔ وہ پہلے ہی سے اس مقام پر پہنچ گئے۔ جس وقت تھکے ماندے سپاہی قیدیوں کو لئے کر وہاں پہنچے اس وقت ان پر حملہ کر دیا۔ سات سو قتل اور تیرہ سو گرفتار ہوئے۔ حضرت خولہ ضرار اور تمام مسلمان قیدی رہا ہوئے۔

معرکہ بھنسا میں حضرت ضرار دو سو سوار لئے آ رہے تھے کہ اچانک کفار کی دو ہزار کی جماعت نے ان پر حملہ کیا خوب لڑائی ہوئی۔ لیکن حضرت ضرار کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گرے۔ کفار نے موقع پا کر ان کو گرفتار کر لیا۔ اور لے چلے حضرت سالم اس معرکے سے بچ کر نکل بھاگے اور ضرار کی گرفتاری کی خبر اسلامی فوج میں پہنچائی فوراً حضرت رافع وغیرہ دو ہزار سوار لے کر ان کے تعاقب میں چلے

حضرت خولہ بھی عربی گھوڑے پر مسلح جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اُن پر آن پڑے اور حضرت ضرار چھڑا لئے گئے۔ کافر بھاگ چلے لیکن ان کی بدقسمتی سے اُدھر سے بھی ایک دستہ اسلامی فوج کا آرہا تھا۔ وہ بیچ میں پڑ گئے اور سب کے سب وہیں مارے گئے۔

ام الخیر رابعہ بصریہؒ

یہ نام تقوے اور پرہیزگاری میں اس قدر مشہور ہے جتنا رستم کا نام بہادری میں یا حاتم کا سخاوت میں۔

رابعہ عربی میں چوتھی کو کہتے ہیں۔ چونکہ حضرت رابعہؒ اپنے باپ کی چوتھی بیٹی تھیں۔ اس لئے یہی ان کا نام رکھ دیا گیا۔ ان کے والد کا نام اسمٰعیل ہے جو قبیلہ عدوی سے تھے۔ اُن کی سکونت بصرہ میں تھی۔

حضرت رابعہؒ کو زہد اور عبادت کی طرف فطرتی لگاؤ تھا اور جب انھوں نے قرآن، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی تو بالکل اسی کی ہو رہی ہیں۔ دن رات ریاضت اور عبادت ان کا شغل تھا اسی وجہ سے ان کو ام الخیر کہنے لگے

علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ عبدہ جو بڑی نیک اور عالمہ عورت گذری ہیں اور حضرت رابعہ رح کی خادمہ تھیں۔ بیان کرتی ہیں رابعہ رح کا یہ قاعدہ تھا کہ رات بھر عبادت کرتی تھیں۔ بعد نماز فجر کے تھوڑی دیر کے لئے مصلے پر سو جاتی تھیں۔ جب صبح ہوتی تو اٹھتی تھیں اور نفس کو ملامت کرتی ہوئی پھر عبادت میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

بڑے بڑے علماء اور صلحا انھیں کے یہاں آکر عبادت کرتے تھے اور اس کو خیر و برکت کا سبب سمجھتے تھے۔ ان کا لقب تاج الرجال تھا۔

ایک بار رات بھر عبادت ہوئی۔ ذوق و شوق کے ساتھ دعائیں مانگی گئیں۔ جب تہجد کا وقت ہوا تو ابو سلیمان دارانی نے جو ایک مشہور ولی گذرے ہیں فرمایا کہ ایسے معبود کا کس طرح شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ جس نے رات بھر عبادت کرنے کی ہم کو قوت اور توفیق عطا فرمائی۔ حضرت رابعہ نے کہا کہ ایسے معبود کا شکریہ یہ ہے کہ آج دن کا اس کے لئے روزہ رکھیں۔

زہد و تصوف میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو امام حسن بصری رح کا تھا۔ امام سفیان ثوری رح جو بڑے مشہور بزرگ اور اعلیٰ پایہ کے محدث تھے اکثر حضرت رابعہ رح کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور ان کی زبان فیض

ترجمان سے باتیں سن کر روح کو خوش اور تازہ کرتے حالانکہ اس زمانے کے تمام علماء و فضلاء اور سادات سے لے کر بادشاہ تک سب امام سفیان ثوری کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے اور اُن سے شرعی مسائل اور تصوف کی باریکیاں پوچھتے تھے۔ مگر باوجود اس کے امام سفیان ثوری کو جب مہلت ملتی تو رابعہ کے جھونپڑے میں پہنچتے اور ان کی مجلس سے فیض حاصل کرتے۔ اس سے حضرت رابعہؒ کے علم و فضل اور اور زہد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جعفر ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ وہ عبادت میں مشغول ہیں اور امام سفیان ثوری بیٹھے ہوئے ہیں جب وہ عبادت سے فارغ ہوئیں تو جعفر نے نہایت تعجب سے کہا کہ مسلمانوں کا پیشوا اور امام بیٹھا ہوا ہے اور تم کو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں۔ رابعہؒ نے کہا کہ میں اللہ کی طرف متوجہ تھی، اور جب کوئی بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو کچھ شک نہیں کہ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ ایسی حالت میں کسی مخلوق کی طرف کیوں توجہ کرنے لگی۔

جعفر کے پاس امام ثوری بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک اُٹھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا کہ مجھکو اس ناصحہ مشفقہ کے پاس لے چلو کہ جس کی مجلس سے جب جدا ہوتا ہوں تو میرے دل کو چین نہیں آتا۔ جعفر نے کہا کہ کون؟

فرمایا کہ رابعہ جب اُن کے یہاں پہنچے تو امام ثوری نے دعا مانگی کہ یا اللہ میں تجھ سے سلامتی کا طالب ہوں۔ حضرت رابعہ یہ سن کر بہت روئیں امام ثوری نے رونے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ تمھاری اس دعا نے مجھکو رُلایا، تم اللہ سے سلامتی چاہتی ہو اور سلامتی نام ہے ترک دنیا کا۔ جس میں تم آلودہ ہو رہے ہو۔ انسان پر بہت افسوس آتا ہے کہ وہ اپنی حالت کو نہیں سنبھالتا۔ نہ خود کوئی کوشش کرنا چاہتا۔ صرف دعا پر بھروسہ کرتا ہے۔

ایک مرتبہ امام سفیان ثوری نے پوچھا کہ آپ کے ایمان کی کیا کیفیت ہے۔ فرمایا کہ میں نے اللہ کو نہ جنت کی اُمید پر پوجا ہے نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ محض محبت اور شوق سے۔ پھر انھوں نے چند شعر معرفت کے پڑھے جو خود انھیں کے تھے۔ وہ معرفت کے اشعار نہایت عمدہ کہتی تھیں شیخ شہاب الدین سہروردی نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں اور تعریف کی ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے بھی ان کے اقوال لکھے ہیں اور مدح کی ہے۔

زہد و عبادت کے ساتھ اِن کو ابتدا ہی سے کچھ ایسا شغف ہو گیا تھا کہ نکاح نہیں کیا۔ کسی نے ایک مرتبہ پوچھا تو فرمایا کہ نکاح کسی وجود پر ہوتا ہے۔ یہاں ہم اپنی ہستی ہی مٹا چکے۔

عبدالواحد ابن زید ایک متمول شخص نے اُن کے زہد و علمیت کا شہرہ سُن کر نکاح کا پیغام بھیجا۔ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اے سیاہ دل تو اپنے لئے اپنی ہی جیسی کوئی سیاہ دل عورت تلاش کرے جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کچھ تیری محبت کی بھی گنجائش نکل سکے۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلندست آشیانہ

دراصل ایسی تارک الدنیا مریم خصائل بی بی کو دنیاوی تعلقات میں پھنسنا بھی ناموزوں تھا اور یہ ترکِ تعلق ان کے لئے زیور تھا نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو تمام سلائق دنیوی میں آلودہ ہیں۔ شعر

درحقِ او مدح درحقِ تو ذم
درحقِ او شہد درحقِ تو سم

اصل یہ ہے کہ نہ تمام دُنیا کے مرد حضرت عیسیٰ ہیں اور نہ تمام عورتیں رابعہ ہیں۔ جو باتیں ایک تارک الدنیا اپنے لئے خلافِ مصلحت سمجھتا ہے بسا اوقات ایک دُنیادار کو اس کی حد سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہؒ حد درجہ کی مستغنی المزاج تھیں۔ بادشاہ وزراء اور امراء ان کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن کبھی کسی قسم کی اپنی حاجت اُن سے ظاہر نہیں کی اور توکل اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کی۔

ایک مرتبہ ان کو کسی چیز کی ضرورت پڑی اور وہ اُن کے پاس نہ تھی کسی نے کہا کہ اگر آپ فلاں شخص کے ہاں کہلا بھیجیں تو مل جائے گی انھوں نے کہا کہ دنیا کی کسی چیز کا سوال تو میں اللہ سے بھی نہیں کرتی جو سارے جہان کا مالک ہے۔ تو ایسے شخص سے کیا کروں جو کسی چیز کا بھی مالک نہیں

ایک دفعہ بیمار ہوئیں۔ امام حسن بصریؒ اُن کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ دروازے پر ایک شخص چار ہزار دینار لیے کھڑا تھا۔ اس نے امام سے کہا کہ ان برکت والی بیوی سے سفارش کر دیجئے کہ میری طرف سے یہ تحفہ حقیر قبول فرمالیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انھیں کی برکت سے یہاں انوارِ الٰہی نازل ہوتے ہیں۔ انھوں نے سفارش کی۔ حضرت رابعہ نے کہا کہ اے حسن! اللہ تعالےٰ اپنے دشمنوں کو بھی روزی دیتا ہے۔ پھر کیا جس شخص کے دل میں اس کی محبت ہو۔ اس کو روزی نہ دے گا۔ میں یہ مال کیوں لوں جو معلوم نہیں کہ حلال ہے کہ حرام ہے۔

مالک بن دینار محدث کہتے ہیں کہ رابعہ کے یہاں گیا۔ دیکھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے کوزے سے وضو کر رہی ہیں۔ ایک پرانی چٹائی ہے کہ وہی مصلّٰے ہے وہی بستر ہے اور سرہانے تکیہ رکھنے کے لئے ایک اینٹ ہے۔ مجھے رقت آئی۔ میں نے کہا کہ میرے بعض دوست دولت مند ہیں۔ کہو تو میں اُن سے سفارش کر کے تمہارے آرام کا کچھ بندوبست کر دوں

انھوں نے کہا کہ مالک! کیا میرے حال کو اللہ تعالیٰ نہیں جانتا۔ میں نے کہا بیشک جانتا ہے۔ کہا کہ جس نے امیروں کو دیا ہے کیا وہ مجھے نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ ضرور دے سکتا ہے۔ فرمایا کہ بس جس حال میں وہ پسند کرے اسی حال میں ہم کو بھی راضی و شاکر رہنا چاہیے۔

ایک دن اُن کے یہاں مجلس گرم تھی۔ دنیا اور اہل دنیا کا تذکرہ آگیا۔ لوگوں نے بعد اس کی برائی بیان کرنی شروع کی اور دیر تک اسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ رابعہ نے کہا کہ بس خاموش رہو۔ تم میں سے ہر شخص دنیادار ہے۔ اگر تمھارے دل میں دنیا کی محبت نہ ہوتی تو تم گو مخالفانہ ہی پہلو سے اس کا اس قدر تذکرہ نہ کرتے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کی انسان کے دل میں جس قدر قدر ہوتی ہے اُسی قدر اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

ایک دفعہ ان کے یہاں ایک شخص آیا جو سر پر پٹی باندھے ہوئے تھا پوچھا کہ کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ سر میں سخت درد ہے۔ کہا کہ تمھاری عمر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تیس سال فرمایا کہ اس سے پہلے بھی کبھی دردِ سر ہوا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ کہا کہ اس تیس سال کے عرصے میں میں نے تم کو کبھی شکریہ کی پٹی باندھے ہوئے نہ دیکھا۔ آج ایک دن کے لئے درد ہوا تو شکایت کی پٹی باندھ لی۔

کسی نے اُن سے پوچھا کہ تم شیطان کو دشمن رکھتی ہو کہ نہیں۔ انھوں

نے کہا کہ رحمٰن کی محبت نے میرے دل میں شیطان کی عداوت کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

کسی نے اُن کی محفل میں عورتوں پر اعتراض کیا کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے کوئی عورت نبی نہیں بنائی گئی۔ حضرت رابعہ نے کہا کہ بیشک ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اگر ہم نبی نہیں ہوئے تو ہم نے خدائی کا بھی دعویٰ نہیں کیا اور یہ بے ادبی مردوں ہی سے ہوئی۔

تین بار حج کیا۔ ایک گدھا پال رکھا تھا اسی پر سوار ہو کر حج کے لئے جاتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ابراہیم ادھم سے بھی مکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ بزرگوں سے بہت ہی خلوص رکھتی تھیں۔ ایک بار کھانا پکا رہی تھیں کہ امام بصریؒ اُن کے یہاں آگئے۔ کھانا چھوڑ کر اُن سے باتیں شروع کیں اور کہا کہ واللہ یہ باتیں کھانے سے بہتر ہیں۔ مغرب تک باتیں کرتی رہیں۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر کھانا پکایا۔

(ایک مرتبہ ان کے یہاں دو درویش مہمان آگئے۔ اُن کے پاس خشک دو روٹیاں تھیں۔ مجبوراً مہمانوں کے سامنے وہی رکھ دیں اتنے میں دروازے پر ایک فقیر نے صدا دی سنتے ہی مہمانوں کے آگے سے وہ دونوں روٹیاں اُٹھا کر اس فقیر کو دے ڈالیں مہمان حیران بیٹھے رہے اور کچھ نہ سمجھے کہ کیا معاملہ ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھتے ہیں کہ ایک

کنیز خوان میں کھانا لئے ہوئے آرہی ہے ۔گرما گرم کھانا مہمانوں کے آگے رکھا اور دیکھا تو پوری بیس روٹیاں تھیں ۔مہمانوں نے تعجب سے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے انھوں نے کہا کہ ان دو خشک روٹیوں سے تمہارا پیٹ تو بھرتا نہیں ۔ اس لئے میں نے فقیر کی صدا سنتے ہی اس کو دے دیا ۔تاکہ اس کے عوض میں اللہ تعالےٰ میرے مہمانوں کے لئے سامان کر دے ۔سو اس نے کھانا بھیج دیا اور ہر ایک روٹی کے بدلے میں دس روٹیاں اُس نے بھیجیں جیسا کہ دس گنا ثواب دینے کا اس نے وعدہ کیا ہے ۔ وہ درویش اُن کے کمال ایمان اور مقبولیت کے قائل ہوگئے ۔

ان کی وصیت ہے کہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپاؤ جس طرح تم اپنے عیوب کو چھپاتے ہو ۔کہا کرتی تھیں میری جو نیکی ظاہر ہوگئی میں اس کو اپنی نیکیوں میں نہیں شمار کرتی ۔

جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو اپنی خادمہ عبدہ سے کہا کہ تم مجھکو غسل دے کر میرے اس جبّہ (ایک گلیمی جبہ جس کو پہن کر وہ رات کو عبادت کیا کرتی تھیں) میں کفنا دینا ۔اُنھوں نے ایسا ہی کیا ۔پھر لوگوں نے ان کو لے جا کر دفن کیا ۔ اُن کی وفات ۱۳۵ھ میں ہوئی ، اور اُن کا مزار کوہِ طور کی

ایک چوٹی پر ہے، جو زیارت گاہ ہے۔

سیّدہ نفیسہ

ایک حدیث ہے کہ "انسان پہلے آسمانوں پر مقبول ہو لیتا ہے تب زمین پر مقبول ہوتا ہے" یعنی جو شخص اپنی نیکیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کی بدولت اپنے آپ کو خدا کا مقبول بندہ ثابت کرتا ہے اس کی تمام لوگ عزّت کرنے لگتے ہیں، اور وہ دنیا میں ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔

خدا کی مقبولیت اور دنیا میں ہر دلعزیزی نہ علم و عقل سے حاصل ہوتی ہے، نہ حسن و جمال سے ملتی ہے، نہ مال و دولت سے خریدی جاتی ہے، نہ طاقت اور قوت کے زور کمائی جاتی ہے۔ اس کے حصول کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے نیکی

مصر ہی میں دیکھو فرعون کیسا طاقت ور تھا۔ ہامان اس کا وزیر کتنا بڑا عقل مند تھا، قارون کس قدر دولت مند تھا مگر سب کے سب اللہ کی بارگاہ سے مردود ہوئے اور تمام مخلوق کے نزدیک ملعون ٹھہرے۔

اسی مصر میں ایک غریب اور کم زور عورت جس کا نام عنوان پر درج ہے گذری ہے جس کے پاس نہ سلطنت تھی نہ جاہ و جلال تھا مگر دل میں نیکی اور پرہیزگاری تھی۔ اسی کی بدولت وہ آج گیارہ سو سال گذرنے کے بعد بھی اس قدر مقبول ہے کہ لوگ ایک پرستش نہیں کرتے اور باقی سب کچھ کرتے ہیں۔

مصر میں بڑے بڑے اولیا اللہ گذرے ہیں۔ مثلاً حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ۔ حضرت سید احمد بدوی رح وغیرہ لیکن جو شرف قبول سیدہ نفیسہ رح کو اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا وہ کسی کو نہیں دیا۔ یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اولیاء اللہ کے مزاروں میں سے مردوں میں خواجہ معین الدین چشتی رح کا مزار ہند میں، اور عورتوں میں سیدہ نفیسہ رح کا مزار مصر میں تمام دنیائے اسلام میں سب سے بڑی زیارت گاہیں ہیں۔

سیدہ نفیسہ رح حضرت امام حسن رض کے بیٹے زید کی پوتی ہیں ان کے باپ کا نام بھی حسن ہے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح پر ہے۔ نفیسہ بنت حسن۔ بن زید۔ بن حسن۔ بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم

ان کی پیدائش ۱۴۵ھ میں مدینہ شریف میں ہوئی پہلے قرآن شریف حفظ کیا، پھر علم تفسیر۔ حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ اُن کے والد حسن خلیفہ بغداد ابو جعفر منصور کی طرف سے ۱۵۰ھ میں مدینہ کے حاکم مقرر

ہوئے۔ اسی سال امام جعفر صادق کے بیٹے اسحاق المؤتمن کے ساتھ اُن کا نکاح کر دیا۔ وہ ان کو مکے میں لے گئے اور وہیں رہنا شروع کیا۔

۱۵۰ھ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ خلفاء عباسی حضرت علی کی اولاد کے دشمن ہو گئے۔ چنانچہ سیدہ نفیسہؒ کے والد کو بھی خلیفہ منصور نے قید کر دیا اور ان کا مال و متاع ضبط کر لیا۔

ان مخالفتوں کی وجہ سے سیدہ نفیسہ مع اپنے شوہر اسحاق المؤتمن کے مکے سے مصر چلی گئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

سیدہ کے علم و فضل اور خاص کر خاندانِ نبوت سے ہونے کی وجہ سے مصر والوں نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ مقام عریش تک ہزار ہا عورتیں ہودجوں میں سوار۔ اور حکام۔ تجار اور علماء و فضلاء ان کی پیشوائی کے لئے آئے۔ وہ مصر کے ملک التجار جمال الدین عبداللہ کے یہاں فروکش ہوئیں۔

مصر اور اس کے اطراف کے تمام لوگ برکت حاصل کرنے کی غرض سے اُن کے پاس آتے تھے اور ہر وقت ان کا مکان علماء فضلاء اور نیز مختلف طبقہ کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ امام شافعی بھی ان کی خدمت میں آکر حدیث سُنتے، اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

اسی درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک یہودی بڑھیا اپنی

اپاہج بیٹی کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان کی برکت سے وہ لڑکی بالکل اچھی ہو گئی، جس کی وجہ سے اس لڑکی کا تمام محلہ مع اس کی والدین کے مسلمان ہو گیا۔ یہ کرامت دیکھ کر اس قدر خلقت ٹوٹی کہ سیدہ گھبرا گئیں۔ اور ارادہ کیا کہ ہم کہیں چلے جائیں۔

مصر والوں پر یہ امر بہت شاق گذرا۔ انھوں نے مصر کے حاکم سری بن الحکم کو آمادہ کیا کہ جس طرح ہو سکے سیدہ کو مصر ہی میں روکے سری اُن کے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ یہاں سے کیوں تشریف لے جانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کثرت ہجوم سے میں عبادت نہیں کر سکتی اور نیز یہ کہ میرا یہ مکان بھی تنگ ہے۔ اس میں اس قدر ازدحام کی گنجائش نہیں۔ سری نے کہا مکان کا تو یہ علاج ہے کہ میرا ایک مکان محلہ درب السباع میں نہایت وسیع ہے۔ میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کو آپ کے لئے ہبہ کر دیا اور اس ازدحام کا بندوبست یہ ہے کہ ہفتہ میں دو روز مقرر کر دیجئے کہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور باقی دنوں میں کوئی نہ آنے پائے تاکہ آپ اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکیں۔

سیدہ نفیسہ رح نے شنبہ اور چہارشنبہ دو دن لوگوں کے واسطے مقرر کیا، اور وہ سری کے محل میں جا کر رہنے لگیں۔ حکام مصر نے بڑی رقم

اُن کے گزارہ کے لئے مقرر کر دی جس سے وہ اپاہجوں، بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کرتی تھیں۔

سیّدہ بڑی عبادت گزار تھیں۔ انھوں نے تین حج کئے۔ اکثر روزے رکھا کرتی تھیں۔ تفسیر اور حدیث سناتیں۔ قرآن شریف کی تلاوت اُن کا شغل تھا۔ بے انتہا رقیق القلب تھیں۔ رات رات بھر عبادت میں کھڑی اللہ کی درگاہ میں رویا کرتی تھیں۔

اُن کی وفات بھی ناگہانی طور پر وقوع میں آئی۔ ۲۰۸ھ میں رمضان کے مہینے میں جبکہ ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ روزہ رکھے ہوئے قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں، یکایک ضعف غالب ہوا اور دفعتہً حالت خراب ہو گئی۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ روزہ توڑ دیجیے، انھوں نے کہا کہ تیس سال سے میری آرزو یہی تھی کہ میں روزہ رکھے ہوئے اللہ کے حضور میں جاؤں۔ اب جبکہ یہ اُمید پوری ہو رہی ہے کیا روزہ توڑ دوں۔ آخر اسی دن انتقال کر گئیں۔

اُن کے شوہر اسحاق نے یہ خواہش کی کہ میں اُن کو مدینہ میں لے جا کر دفن کروں لیکن مصر کے لوگوں نے کہا کہ آپ اس برکت کو ہم سے نہ چھینیے اور ان کو یہیں دفن کر دیجیے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اصرار سے اسی مکان میں جس میں وہ رہتی تھیں اور جو مقام

درب السباع میں مصر قدیم اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے ان کو دفن کر دیا۔
ملک عادل ایوبی کی والدہ نے ان کی قبر پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی اور اس کے متعلق ایک لنگر خانہ بھی بنوا دیا۔

ان کی مقبولیت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ جس قدر حکمران خاندان مصر میں ہوئے مثلاً فاطمی عباسی، چرکسی ایوبی ترکی وغیرہ ان میں سے ہر ایک شخص ان کے مزار کے احاطہ میں مدفون ہونا موجب برکت اور باعثِ نجات سمجھتا تھا۔ چنانچہ آج تمام گذشتہ حکمران خاندانوں کے بادشاہوں امراء اور ارکانِ سلطنت کی بیشتر قبریں حضرت سیدہ نفیسہؒ ہی کے احاطے میں ملیں گی۔ زائرین اور عقیدت مندوں کی اس مقام پر بھیڑ لگی رہتی ہے۔

۷۲۵ھ میں ملک اشرف خلیل نے اس مزار پر ایک بڑا بھاری مدرسہ بنوا دیا تھا اور اس پر بہت بڑی جائداد وقف کر دی تھی۔

یہ عقیدت اس قدر بڑھتی چلی گئی کہ سیف الدین قائتبائے نے جو ۸۷۳ھ میں مصر کے تخت سلطنت پر بیٹھا۔ حضرت سیدہ نفیسہؒ کے مولود کی رسم جاری کی۔ اس مولود کی مجلس میں خلیفہ وقت چاروں مذہب کے قاضی اور تمام اُمراء اور اعیانِ سلطنت شریک ہوتے تھے اور نہ صرف قاہرہ بلکہ دور دور سے لوگ اس میں

اس میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے سلطنت کی طرف سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کیے جاتے تھے اور ہر شخص کو کھلائے جاتے تھے۔

اس قسم کے متبرک مزاروں پر ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جو عوام الناس کی عقیدت مندی کو بڑھاتے ہیں۔ حضرت سیدہ نفیسہؒ کے مزار کی بھی بہت سی کرامتیں مختلف کتابوں میں ہم نے دیکھیں ہم ان میں سے ایک دو واقعہ لکھتے ہیں جس سے عوام کی عقیدت مندی کا اندازہ ہو سکے گا۔

۹۲۶ھ میں مصر میں مراغہ کا ایک تاجر رہتا تھا جس کا نام محی الدین تھا۔ اس کی ایک لڑکی سات سال کی عمر کی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کے سر پر ایک عراقی زرین قیمتی ٹوپی تھی۔ سامنے ایک لڑکے کی دکان تھی جو بچوں کے لیے کھلونے اور قمریاں بنایا کرتا تھا۔ اس حریص دکاندار لڑکے نے جب اس بھولی بھالی کمسن لڑکی کے سر پر زریں ٹوپی دیکھی تو اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ وہ اٹھا اور اپنے حبشی غلام کو بھی ساتھ لیا۔ دونوں مل کر لڑکی کو بہکا پھسلا کر حضرت سیدہ نفیسہ کے مزار کے ایک اندھیرے تہ خانے میں لے گئے۔ وہاں لے جا کر چھری سے اس کا گلا کاٹا اور ٹوپی لے کر بھاگ گئے۔ وہ بچی خاک و خون میں تڑپتی رہی۔

حیف
AR

اِدھر لڑکی کی تلاش ہوئی۔ ماں باپ پریشان تھے کہ کیا ہوئی کہاں گئی، آخر اس کے باپ کو شبہ ہوا کہ معلوم ہوتا ہے کسی بدمعاش نے ٹوپی کی خاطر اس کو مار ڈالا۔ یہ خیال کر کے کہ جس نے مارا ہوگا وہ ٹوپی بیچنے کے لئے بازار ہی میں آئے گا۔ وہ دوڑا ہوا بازار میں گیا تمام سوداگروں کو جن سے رات دن اس کا لین دین تھا جمع کیا، اور واقعہ سنایا اور کہا کہ جب اس قسم کی ٹوپی کوئی شخص بازار میں بیچنے کے لئے آئے تو خیال رکھو۔ وہی میری لڑکی کا قاتل ہوگا۔

شام کو قمری ساز ٹوپی لے کر بازار میں بیچنے کو پہنچا۔ ایک دوکاندار کو دکھلائی اُس نے اس کی قیمت چالیس دینار (سو روپے) لگائی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب تک اس بات کی ضمانت نہ دوگے کہ یہ چوری کا مال نہیں ہے، اس وقت تک میں اس کو نہیں خریدوں گا۔ اس نے ضمانت دینے میں حیلہ حوالہ کیا اور چند سوداگروں نے دیکھا اُنھیں شبہ ہوا۔ جھٹ محی الدین کو خبر کی وہ دوڑا ہوا آیا۔ دیکھا تو اسی کی لڑکی کی ٹوپی ہے۔

وہ لڑکے کو پکڑ کے مصر کے کوتوال میر کشتغا کے پاس لے گیا۔ اس نے اس لڑکے کو خوب پیٹا۔ آخر اس نے اقبال کیا کہ میں اور میرے حبشی غلام دونوں نے مل کر اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔ کوتوال

ان کو ساتھ لے کر موقع واردات پر تحقیقات کو چلا۔ وہ دونوں اسی تاریک تہہ خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو وہاں لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ لیکن زندہ ہے اور ہوش و حواس میں ہے۔ اس کا باپ اس کو اٹھا لایا۔ علاج کیا۔ چند روز کے بعد وہ بالکل اچھی ہوگئی۔

ہاں تو اب مشہور یہ ہے کہ اس لڑکی نے کہا کہ وہاں پڑے پڑے میں نے دیکھا کہ ایک نورانی شکل کی بیوی سفید لباس پہنے ہوئے میرے پاس آئیں۔ انھوں نے میرے چہرے سے خون پونچھا۔ بہت دلاسا اور تسلی دلائی اور کہا کہ تو رو نہیں ہم آج ہی شام کو تجھے تیری اماں کے پاس بھجوا دیں گے۔ اس سے مجھے تسلی ہوگئی اور میں آرام سے لیٹی رہی۔

۱۱۷۳ھ میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

مصر کے چند مسلمان عیسائیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے تھے انھوں نے اس شب کہ جس میں سیدہ نفیسہ رح کا مولود کیا جاتا ہے۔ کہیں سے کسی طرح پر ایک بکری حاصل کی تاکہ اس کو نذر چڑھائیں اور سیدہ کی برکت سے اُس قید سے ان کو خلاصی حاصل ہو۔

وہ بکری ذبح کرنے کی تیاری میں تھے کہ عیسائی افسر نے دیکھ لیا۔ اس نے منع کیا کہ اور بکری ذبح کرنے سے روک دیا۔ اسی سبب

کو اس نے ایسا خوفناک خواب دیکھا کہ صبح اُٹھتے ہی مسلمان قیدیوں کو آزاد کیا اور اُن کو زادِ راہ وغیرہ دے دیا کہ وہ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔

وہ قیدی خوشی خوشی مصر میں واپس آئے اور اس مبارک بکری کو بھی اپنے ساتھ لائے اور سیدہ کے مزار پر اس کو پہنچا دیا۔

وہاں کے مجاور شیخ عبداللطیف نے اس سونے کی چڑیا کو ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہنائے اور مشہور کیا کہ یہ بکری خاص سیدہ نفیسہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی قبر سے بلند آواز سے مجکو اس کے پرورش کی وصیت کی ہے۔ جس شخص کے نذرانہ میں سے یہ کچھ کھالے گی اس کی مراد پوری ہو جائے گی اور یہ سوائے کیلے اور انجیر کے اور کچھ نہیں کھاتی۔

خلقت خدا ٹوٹ پڑی۔ بڑے بڑے امراء کے گھروں سے اس کے لئے زیورات گئے اور کیلے اور انجیر کی ڈالیاں چڑھنے لگیں اور جوق در جوق مرد عورت اس کی زیارت کے لئے آنے لگے۔

امیر عبدالرحمٰن کتخدا والی مصر نے اس فتنہ کو رفع کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ شیخ عبداللطیف کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے حرم کے لوگ اس بکری کی زیارت کا شوق رکھتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے

بھجوا دیجئے تو بہتر ہو۔ شیخ موصوف بکری کو اپنی گود میں لے کر اپنے خچر پر سوار ہوئے طبلے بجتے ہوئے، جھنڈیاں ہلتی ہوئیں اور مع ساز و یراق کے روانہ ہوئے۔ خلقت کا ایک جم غفیر ساتھ ساتھ تھا۔ پہنچنے کے ساتھ ہی امیر موصوف نے اس بکری کو محل میں بھجوا دیا جہاں وہ فوراً ذبح کر کے پکائی گئی اور دسترخوان پر لائی گئی۔ شیخ نے بھی بے خبری میں خوب مزے لے کر اس کا گوشت کھایا۔ اُمرا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے، اور آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر کر کے ہنستے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد امیر نے شیخ کو بتلا دیا کہ یہ اسی بکری کا گوشت تھا اور پھر ان کو اُن کی ابلہ فریبی اور خلقت خدا کو گمراہ کرنے پر بہت ڈانٹا اور اسی بکری کی کھال اُن کے سر پر رکھ کے اسی ساز و سامان کے ساتھ واپس کیا اور ساتھ میں سپاہی مقرر کر دئے کہ اسی طرح مزار تک پہنچا دو۔

زبیدہ خاتون

یہ معزز خاتون جو اپنے جاہ و جلال اور حسن و جمال کے لحاظ سے دنیا میں بے مثل ہو گزری ہے۔ جعفر کی بیٹی اور خلیفہ منصور عباسی کی پوتی تھی

اس کا باپ جعفر نہایت خوبصورت نوجوان تھا اور عباسی خاندان میں جن کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ تھی خوب صورتی اور دانائی میں ہر ایک سے ممتاز تھا۔ اس کی پہلی اولاد یہی زبیدہ خاتون ہے، جو ۱۴۹ھ میں اپنے پرشان دادا کے عین حیات پیدا ہوئی۔

منصور اپنی اس خوب صورت اور ہونہار پوتی کو ہر وقت اپنی آغوش میں رکھتا تھا۔ اس کی شگفتہ طبیعت اور پیاری صورت سے اس کو کچھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اپنے پاس سے اس کا الگ ہونا گوارا نہیں کرتا تھا۔

اس کا نام امتہ العزیز کنیت ام جعفر اور لقب طاہرہ ہے۔ لیکن منصور پیار سے اس کو زبیدہ زبیدہ کہا کرتا تھا۔ آخر یہی اس کا نام ہو گیا

اس زمانے میں مسلمان عام طور پر عورتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ زبیدہ کو بھی تعلیم اچھی دلائی گئی شاعری، علم ادب، عربی و فارسی، تفسیر فقہ اور نحو میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور چونکہ طبیعت میں اعلیٰ درجے کی شاہانہ نفاست تھی اس وجہ سے فنونِ لطیفہ سے بھی اس کو بہت ذوق تھا۔

سب سے پہلے سونے اور چاندی کے قمقمے اسی نے ایجاد کیئے جو آبنوسی مرصع کرڑوں میں اس کے قصر میں لٹکائے گئے۔ چھت گیری بھی اسی کی ایجاد ہے۔ اپنے لئے مختلف رنگ کے موزے بنواتی تھی جن پر جواہرات ٹنکتے تھے، اور سنہری اور روپہلی کام ہوتے تھے۔ انھیں موزوں سے بعد میں کفش زر دوز نکالا گیا۔

ریشمی کپڑوں پر طرح طرح کے بیل بوٹے بناتی تھی عنبر کی شمع بھی اسی کی ایجاد ہے۔ الغرض فنون لطیفہ میں اسی نے جان ڈالی۔

اس خوبصورت اور ہر دلعزیز شاہزادی کا نکاح سنہ ۱۶۵ھ میں شاہزادہ ہارون الرشید کے ساتھ کیا گیا جو اسی کی طرح نیک خوبصورت ہر دلعزیز اور علم کا شائق تھا، اور جس کے نام سے آج دنیا کے تمام لوگ عام طور پر واقف ہیں۔

سنہ ۱۶۵ھ میں مہدی کی خلافت کے زمانے میں محمد ابن سلیمان

کے عالی شان محل میں اس کی وداع ہوئی۔ جو زبیدہ کو دے دیا گیا تھا لیکن اس کو پسند نہ آیا۔ اس لئے عباسہ کو ملا جو ہارون کی بہن تھی۔

یہ شاہزادی نہایت لائق اور عقل مند تھی۔ متانت اور وقار اس کی ذاتی وراثت تھی۔ بلا استثنار عباسی خاندان میں اس سے زیادہ معزز کوئی عورت نہیں گذری ہے۔

اس کا شوہر ہارون الرشید جو ایک نہایت عالی دماغ، بلند حوصلہ اور وجیہہ بادشاہ تھا اس پر بھی اس نے ہمیشہ اپنا اثر قائم رکھا۔ شاہی محل میں ہر طرح کی خواتین تھیں لیکن کسی کا اثر اور اقتدار اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں تھا۔ یہی محل کی افسر اور مالکہ تھی۔

اس کی خوش خلقی اور رحمدلی مشہور تھی۔ درباریوں میں سے جب کسی پر خلیفہ کی خفگی ہوتی اور وہ معزول یا قید کیا جاتا تو اسی کی سفارش سے اس کو نجات ملتی تھی۔

ایک مرتبہ قاسم کی سواری نکلی جو ہارون کا بیٹا تھا کچھ سوار آگے تھے کچھ پیچھے اور نہایت کروفر سے چلا جاتا تھا راستہ میں ابو العتاہیہ نے جو ہارون کا درباری شاعر تھا سلام کیا لیکن اس نے خیال نہیں کیا اور چلا گیا۔ ابو العتاہیہ نے ایک شعر پڑھا جس کے معنی یہ ہیں۔

"کہ انسان جہالت کی وجہ سے گھمنڈ کرتا ہے، یہ سمجھتا ہے

کر گویا موت کی چکی اس کو نہ پیسے گی۔"

یہ خبر قاسم تک پہنچی۔ اس نے اس بڈھے شاعر کو بلوایا اور قید خانہ میں بھیج دیا۔ اس غریب نے وہاں سے زبیدہ کے پاس چند اشعار لکھ کر بھیجے جن کو دیکھ کر اُسے رقت آئی۔ اُس نے بادشاہ سے سفارش کی اور آخر وہ رہا ہو گیا۔

ہارون اگرچہ خود بڑا فیاض تھا۔ لیکن زبیدہ نے اس کی فیاضی کو بھی مات کر رکھا تھا۔ تمام بغداد کے گھرانے اس کے ممنون اور رہین احسان تھے۔

اس خاتون کا دین و مذہب یہ تھا کہ بنی آدم کے ساتھ جس قدر ہو سکے سلوک کرو۔ چنانچہ اس کے پاس بےحد دولت تھی۔ علاوہ بریں پچاس لاکھ درہم سالانہ اس کی جاگیر کی آمدنی تھی۔ سب اس نے رفاہِ عام کے کاموں پر صرف کر دی۔

بغداد سے دمشق تک جا بجا پل۔ کنوئیں اور سرائیں بنوا دیں جن کی وجہ سے آنے جانے والوں کو بہت آرام ملنے لگا۔ اب تک وہ تمام زبیدہ ہی کے نام سے مشہور ہیں۔

مکے اور مدینہ کے درمیان میں بھی اسی طرح جہاں جہاں حاجیوں کا قافلہ اُترتا ہے اُن کے آرام کے لئے کنوئیں اور منازل بنوا دیئے۔

سب سے بڑا کام جو اس نے کیا ہے اور جو تاریخ میں عورتوں کے کارناموں میں سنہری حرفوں سے ہمیشہ لکھا جائے گا، وہ یہ ہے کہ اس نے حجاز میں نہر زبیدہ نکلوائی۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ سن ۱۹۰ھ میں جب وہ حج کے لئے گئی تو حجاز میں سخت قحط تھا، چاہ زمزم بھی خشک تھا۔ پانی اس قدر گراں تھا کہ ایک مشک ایک اشرفی کو آتا تھا۔

زبیدہ نے چاہِ زمزم کو کھدوایا۔ اس میں پانی نکلا۔ پھر اس نے سوچا کہ ایسی کوئی صورت ہونی چاہیے جس کی وجہ سے ان مقامات میں آسانی کے ساتھ پانی میسر آ سکے۔

اس لئے کارپردازوں اور واقف کاروں کو بلا کر اس معاملے میں مشورہ کیا کہ کس صورت سے مکہ تک پانی پہنچایا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ طائف کی طرف کوہ طاد ہے جہاں سے ایک چشمہ نکل کر وادی سے حنین کی طرف آتا ہے اور وہاں کی کھیتیاں اور باغات اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ وہی چشمہ مکے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن راستے میں اس قدر پہاڑ واقع ہیں کہ اس کام میں انتہا دولت صرف کرنی پڑے گی۔ زبیدہ نے کہا کہ اگر ایک کدال مارنے کی قیمت ایک اشرفی ہوگی، تب بھی میں ادا کروں گی۔ لیکن یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

الغرض اس کے حکم کے مطابق کام شروع کیا گیا۔ پہلے وادی کے کھیت اور باغات وغیرہ خرید لئے گئے اور نہر حنین کے ساتھ دوسرے پہاڑی جھرنے اور سوتے لاکر ملا دئے گئے جن سے وہ اچھا خاصا ایک چشمہ ہو گیا۔ اور متواتر تین سال کی محنت میں یہ نہر مکے تک پہنچائی گئی۔

۱۹۳ھ میں جب یہ نہر پوری ہو گئی تو وہ اس کو دیکھنے کے لئے پھر مکہ مکرمہ گئی۔ اس نے نہر سے پانی نکالنے اور نہانے کے لئے جا بجا سقاے اور حوض بنوائے اور نیز چونکہ میدان عرفات میں جہاں کہ تمام مسلمان حج کے لئے جمع ہوتے ہیں وہاں بھی پانی کی سخت قلت تھی اس لئے اس کے حکم کے مطابق کوہ کرا سے جو چشمہ نکل کر وادی نعمان میں گرتا ہے اس سے نہر نکال کر عرفات تک پہنچائی گئی اور خاص موقف شریف حج میں بہت سے حوض بنا دئے گئے تھے کہ وہ بھرے رہیں تاکہ جب حاجیوں کا مجمع ہو تو ان کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔

عرفات سے اس نہر کو آگے لے جاکر مزدلفہ تک پہنچایا اور پھر وہاں سے مقام منی کے قریب پہنچا کر ایک بہت بڑا کنواں جو جنوں کی بنائی ہوئی ایک خوفناک عمارت معلوم ہوتی ہے۔ کھدوا کر اس میں اس نہر کو گرا دیا۔

یہ نہر زمین دوز ہے اس پر ایک لاکھ اشرفیاں صرف ہوئیں کا ریز

جب اس کا حساب بنا کر زبیدہ کے پاس لے گئے تو اس نے اس کو دجلہ میں پھنکوا دیا اور کہا کہ ہمارے یہاں حساب کا کیا کام، ہم نے تو یہ کام حسبۃً للہ کیا ہے۔ جس قدر ہمارے ذمہ باقی ہے لو۔ اور جو ہمارا باقی ہو ہم نے معاف کیا۔

امتداد زمانہ سے اکثر یہ نہر خراب ہوتی رہی اور خلفاء اور شاہانِ اسلام برابر اس کی مرمت کرتے چلے آئے۔ سلطان سلیمان اعظم کے زمانے میں چشمہ عرفات بالکل خشک ہو گیا۔ سلطان نے اس کی مرمت کا ارادہ کیا لیکن اس کی بیوی ملکہ حضرت خانم سلطانہ نے کہا کہ جس طرح ہارون الرشید نے اپنی بیوی کو اس نہر کے بنانے کا موقع دیا آپ بھی مجھکو اس کی مرمت کا موقع دیں۔ سلطان نے منظور فرمایا۔ ملکہ موصوفہ نے دس لاکھ اشرفیوں کے خرچ سے تمام نہر کو از سر نو درست کرا دیا۔ کئی جگہ سے پہاڑ کاٹ کر چشمے ملائے گئے۔ اس وقت سے سلطنت عثمانیہ کی طرف سے ایک باقاعدہ محکمہ اس نہر کی حفاظت اور نگرانی کے لئے قائم کر دیا گیا جو آج تک برابر اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے اور یہ نہر بدستور جاری ہے اور حجاز کی شہ رگ خیال کی جاتی ہے۔ اب تک اس کا نام نہر زبیدہ ہی ہے۔

دوسری بار جب زبیدہ مکہ میں گئی تھی تو اس نے بیس ہزار مثقال سونے کے پتر خانہ کعبہ کے دروازے اور چوکھٹ پر جڑوائے

تھے۔

اس عالی حوصلہ عورت نے کئی باغ اور محل بھی تیار کرائے لیکن ان کا مفصل حال نہیں مل سکا۔ فارس کا شہر تبریز اس نے آباد کیا جو اس کی جاگیر کا مرکز تھا۔

علم دوستی کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے محل میں ایسی لونڈی نہیں رکھتی تھی جو پڑھی لکھی نہ ہو۔ قرآن شریف سے بہت شغف رکھتی تھی ہر وقت سو لونڈیاں اس کے قصر میں قرآن خوانی کرتی رہتی تھیں دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آرہی ہے۔

اس کے بطن سے صرف ایک بیٹا امین پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کی دوسری عورتوں سے اور کئی بیٹے مامون قاسم اور صالح وغیرہ تھے مگر زبیدہ سب کو یکساں سمجھتی تھی اور ہر ایک کی تعلیم سے دلچسپی رکھتی تھی۔

ہارون کے مرنے کے بعد امین تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس موقع پر انبار کے مقام میں زبیدہ جاکر اپنے بیٹے سے ملی۔ اس وقت اس کا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ اس سے پیشتر دنیا میں شاید ہی کسی عورت کا ہوا ہو۔

لیکن امین دور اندیش اور مدبر نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا بھائی مامون جو خراسان کا حاکم تھا، خلافت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا آخر دونوں میں لڑائی ہوئی۔ ساڑھے چار برس خلافت کرنے کے بعد امین مقتول ہوا اور مامون تخت پر بیٹھا۔

اس موقع پر بعض امرا نے زبیدہ کو بہت اُبھارا کہ جس طرح حضرت عائشہ رضؓ حضرت عثمان رضؓ کے خون کا بدلہ لینے کی غرض سے حضرت علی رضؓ سے لڑی تھیں اسی طرح تم بھی اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لئے مامون سے لڑو۔ اس نے کہا کہ معاذ اللہ کجا عورتیں اور کجا خوں ریزی۔

اس کے بعد زبیدہ نے مامون کو ایک خط نہایت پر درد اشعار میں لکھا جس کو پڑھ کر مامون بہت رویا اور کہا میں وہ تو نہیں کہتا جو حضرت علی رضؓ نے کہا تھا۔ جب ان کو حضرت عثمان رضؓ کے قتل کی خبر ملی تھی کہ "میں نہ راضی ہوں نہ میں نے حکم دیا" لیکن یہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تو میری معزز طاہرہ کا دل رنج و غم سے پاک کر دے۔

ایک تذکرہ میں نظر پڑا کہ زبیدہ نے امین کے مرثیہ میں فارسی زبان میں یہ رباعی لکھی تھی

اے جان جہان جہان ناخوش بے تو　　　بغداد پریشاں مشوش بے تو

رفتی تو دمن بے تو بماندم فریاد! تو درخاکی دمن در آتش بے تو

اگر یہ بیان صحیح ہو تو فارسی شاعری میں سب سے پہلا یہ کلام ہوگا۔ اور ہم زبیدہ کو اس کا موجد کہہ سکیں گے کیونکہ مامون کے زمانے سے پہلے فارسی شاعری کا قطعاً وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

خلیفہ مامون نے اس محترم خاتون کے ساتھ وہی برتاؤ رکھا جو کوئی لائق شاہزادہ اپنی ماں کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

دو لاکھ دینار سالانہ اس کی جاگیر مقرر کی تھی تعجب ہے کہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ مامون نے امین کے دونوں بیٹوں موسیٰ اور عبد اللہ اور زبیدہ کو افریقہ کی طرف بھیج دیا تھا۔ لیکن اور تواریخ سے قطعاً اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

یہ ممکن ہے کہ رنج و غم مٹانے کے لئے یا انتقام کے خوف سے کچھ دن کے واسطے بھیج دیا ہو۔ لیکن زبیدہ نے اپنی آخری زندگی کے دن بغداد ہی میں بسر کئے اور وہیں ۲۱۶ھ میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔

بیگمات

ترکان خاتون

سلجوقی خاندان کی حکومت تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دنیائے اسلام کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اسی میں طغرل اور سنجر وغیرہ بڑے بڑے نامی سلاطین ہوئے۔ لیکن اس خاندان کا گل سرسبد سلطان جلال الدین ملک شاہ ہے۔ اس کی حکومت کا رقبہ دیوار چین سے قسطنطنیہ کی فصیل تک اور انتہائے شمال سے آخر یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہان روم اس کے باجگزار تھے۔

مغلیہ سلطنت میں عہد شاہ جہاں کی طرح ملک شاہ کا زمانہ بھی عدل وداد و علم و شریعت اور امن و عافیت کا زمانہ تھا۔ اسی کا وزیر نظام الملک تھا جس نے بغداد کی مشہور اسلامی درسگاہ نظامیہ قائم کی۔

ترکان خاتون ملک شاہ کی بیوی تھی اور وہ ترکوں کے قدیم بادشاہ افراسیاب کے خاندان سے تھی جو کیکاؤس اور رستم کا مدمقابل اور حریف تھا۔

ترکان خاتون بوجہ اپنی لیاقت اور بیدار مغزی کے ملک شاہ کی مشیر خاص بلکہ امور سلطنت میں شریک غالب تھی۔ سلطان بلا اس کی

رائے اور مشورے کے کوئی کام انجام نہیں دیتا تھا۔ اور سلطنت کے تمام کاموں میں اس کی رضامندی کو مقدم رکھتا اور اس کی کسی بات کو رد نہ کرتا۔ کیونکہ اُس کو اُس کی دانش مندی اور عقل پر پورا بھروسہ تھا۔

ترکان خاتون خود سلطنت میں دورے کرتی تھی۔ کئی بار دربار خلافت یعنی بغداد میں بھی گئی۔ امرار کو اس نے بڑے بڑے عطیے اور جاگیریں دیں۔ لوگ اس کے انعام واکرام سے مالا مال ہو گئے اور تمام ملک میں وہ حد درجہ ہر دلعزیز ہو گئی۔

اس زمانے میں خلفار بغداد کی سلطنت اگرچہ بالکل محدود ہو گئی تھی لیکن ان کا مذہبی اور خاندانی اثر اس قدر تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اور سلاطین اُن کے آستانہ کی خاک پر اپنی پیشانی رگڑنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس لئے سلجوقی سلاطین کی یہ دلی خواہش تھی عباسی خاندان سے کسی طرح پر ہمارا پیوند ہو جائے۔

خلفار عباسی نے بھی سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ملکی مصلحت کے لحاظ سے اُن کے ساتھ رشتہ کرنا منظور کر لیا چنانچہ طغرل کی بھتیجی ارسلان خاتون خلیفہ قائم بامر اللہ کے ساتھ بیاہی گئی۔

جب مقتدی بامر اللہ جو ارسلان خاتون کا بیٹا تھا خلیفہ ہوا تو اس نے ترکان خاتون کی بیٹی خاتون کے ساتھ اپنے نکاح کے پیغام

کے لئے وزیر فخر الدولہ کو بطور سفارت کے سلطان ملک شاہ کے دربار میں بھیجا۔

فخر الدولہ نے اصفہان میں پہنچ کر سلطان کی باریابی حاصل کی۔ اور مقصد بیان کیا۔ سلطان نے کہا کہ اس معاملہ کا دارومدار ترکان خاتون پر ہے آپ کو اس کے یہاں جانا چاہیئے۔ چنانچہ فخر الدولہ کے ساتھ اس نے اپنے وزیر نظام الملک کو بھی کر دیا۔ اور یہ دونوں مع حشم و خدم کے ترکان خاتون کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور پیغام گذرا۔

ترکان خاتون نے چند شرائط پیش کئے۔ منجملہ اُن کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ خاتون کی موجودگی میں خلیفہ کسی دوسری عورت سے شادی نہ کرے۔ جب دربار خلافت سے تمام شرائط منظور ہو گئے۔ تو نکاح ہوا۔

نکاح کے بعد ترکان خاتون خود اپنی بیٹی کو لے کر بغداد کو روانہ ہوئی۔ جہیز کا سامان ۱۳۳ اونٹوں اور ۷۴ خچروں پر لادا گیا ہر ایک پر زرین جھول پڑی ہوئی تھی اور ان کے طوق اور زیورات بالکل سونے اور چاندی کے تھے۔ ۶ خچروں پر بارہ صندوق خالص چاندی کے تھے جن میں زیورات اور جواہرات بھرے ہوئے تھے جن کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

جہیز کے آگے آگے سعد الدولہ گوہر آئین سلطانی سفیر اور امیر

برسق اور پیچھے پیچھے فوج اور دوسرے امراء تھے۔ راستے میں جو شہر آتا تھا۔ وہاں کے لوگ استقبال کر کے دلہن پر اشرفیاں نچھاور کرتے تھے۔

جس رات کو یہ قافلہ بغداد میں داخل ہونے والا تھا۔ اس رات کو خلیفہ کے حکم سے تمام شہر کی آئین بندی کی گئی۔ شاہی محل اور راستہ میں چراغاں ہوا۔ خلیفہ نے پیشوائی کے لئے وزیر ابو شجاع کو بڑے کروفر کے ساتھ روانہ کیا۔ ہزارہا سوار مشعلیں لئے ہوئے آگے آگے تھے ان کے پیچھے وزیر کی سواری اور حشم و خدم تھے۔

خلیفہ کا خاص خادم ظفر شاہی محافہ لے کر آیا جو بالکل سنہری اور مرصع تھا۔ خاتون اپنے میکے کی سواری سے اتار کر سسرالی محافہ میں سوار کرائی گئی۔ اب با ترتیب یہ جلوس بغداد میں داخل ہوا۔

سب سے پہلے وزیر نظام الملک کی سواری تھی جس کے آگے سوار ہاتھوں میں مشعلیں لئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد امراء خلافت کی سواریاں تھیں۔ پھر ان کی بیبیوں کی۔ ہر ایک سواری الگ الگ پورے تزک و احتشام کے ساتھ تھی۔ ممالیک، حشم و خدم اور شمعیں اور مشعلیں سب کے ساتھ تھیں۔

اس کے بعد خاتون کا محافہ تھا جس کے جلو میں سو مسلح

ترکی کنیزیں نہایت زرق برق لباس میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ محافہ کا قبہ جواہرات کی چمک سے روشنی میں جگ مگ کرتا تھا اور تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

وہ رات بغداد کی یادگار راتوں میں سے شمار کی جاتی ہے اور شاید ہی ایسی دھوم دھام کسی شب کو وہاں ہوئی ہوگی۔

صبح کو خلیفہ نے ایک شاندار دربار کیا۔ سلجوقی امرار کو خلعت فاخرہ اور انعام عطا فرمایا۔ اور ترکان خاتون اور دوسری سلجوقی خواتین کو گرانبہا جوڑے دیئے۔

خاتون ایک سال تک وہاں رہی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام جعفر بن مقتدی بامر اللہ رکھا گیا۔ لیکن آخر میں خلیفہ نے بعض شرطیں پوری نہیں کیں جس کی وجہ سے ناچاقی ہوگئی۔ اور ترکان خاتون نے اپنی بیٹی کو مع نواسے کے اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن اصفہان پہنچتے ہی وہ انتقال کر گئی۔ بغداد میں اس کی موت کا بڑا ماتم کیا گیا۔ شعرار نے درد آمیز مرثیے لکھے۔

اسلامی سلطنتوں میں ولی عہدی کے معاملے میں اکثر پیچیدگیاں پڑتی رہی ہیں۔ ملک شاہ کی سلطنت میں بھی اس معاملے نے شطرنج کی بساط کی صورت اختیار کر لی۔

واقعہ یہ تھا کہ ترکان خاتون چاہتی تھی کہ سلطان کا سب سے چھوٹا بیٹا محمود جو اس کے بطن سے تھا ولی عہد ہو۔ نظام الملک اس کا حامی نہیں تھا وہ بادشاہ کے بڑے بیٹے برکیارق کا طرفدار تھا جو ملک شاہ کی بڑی بیوی زبیدہ خاتون سے تھا۔

زبیدہ خاتون اپنے بیٹے برکیارق کی جان کو خطرہ میں دیکھ کر خوفزدہ تھی۔ اس لئے اس نے نظام الملک اور ممالک نظامیہ (جو نظام الملک کے زرخرید غلام تھے اور سلطنت میں بہت قوی اثر رکھتے تھے) کے دامن میں پناہ لی۔

ملک شاہ کا دوسرا وزیر تاج الملک جو لیاقت اور قابلیت میں نظام الملک ثانی تھا۔ ترکان خاتون کا ہم خیال تھا۔ آخر اس کشمکش نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس کا نتیجہ نظام الملک کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ترکان خاتون کے لئے اب مطلع صاف تھا۔ لیکن قضاء الہی سے اسی اثنا میں ۴۸۵ھ میں ۳۸ سال کی عمر میں ملک شاہ بھی انتقال کر گیا۔ ترکان خاتون نے اس کی موت کو بالکل مخفی رکھا۔ امراء کو بڑے بڑے عطیے دیئے اور ان سے اپنے بیٹے محمود کی اطاعت کا حلف لیا۔ امیر کربوقا کو سلطان کی مہر دے کر دارالسلطنت اصفہان میں

بھیجا۔ وہاں اس نے قلعہ کی کنجیاں حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ سب کام تاج الملک کے ذریعے سے ہوا۔

بعدازاں ترکان خاتون ملک شاہ کی لاش کو لے کر مع اپنے نواسے کے بغداد کو روانہ ہوئی۔ تمام سلطنت میں یہ شہرہ تھا کہ سلطان بغداد کو جا رہا ہے۔ کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ مر گیا ہے۔

بغداد میں خلیفہ سے اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرا بیٹا تخت نشین کیا جائے۔ خلیفہ نے منظور کیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ سلطنت محمود کی ہو، خطبہ میرے نام کا پڑھا جائے۔ ملکی اختیارات ترکان خاتون کے ہاتھ میں رہیں۔ تاج الملک وزیر اعظم ہو، اور امیر انز سپہ سالار بنایا جائے۔

ترکان خاتون نے اس کو منظور نہیں کیا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ تمھارا بیٹا نابالغ ہے شرعاً اس کی ولایت جائز نہیں ہے اس لیے یہ سب شرطیں لگائی گئی ہیں تو مجبوراً اسے ماننا پڑا۔

یہ سب امور طے کر کے اس نے اصفہان میں برکیارق کو گرفتار کرنے کے لئے فوج بھیجی وہ گرفتار کر کے قید کر لیا گیا۔ لیکن جب ممالک نظامیہ کو سلطان کی وفات کی خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے فوراً مسلح ہو کر قید خانے کو توڑ ڈالا۔ برکیارق کو قید سے آزاد کر کے تخت پر

بٹھال دیا۔

ترکان خاتون ایک عظیم الشان فوج لے کر برکیارق کے مقابلے کے لیے چلی۔

برکیارق نے جب ترکان خاتون کی آمد کی خبر سُنی تو مع ایک نظامیہ کو لے کر اصفہان سے نکل کر رے کی طرف روانہ ہوا۔ خوش قسمتی سے راستے میں امیر ارغش نظامی مع اپنی فوج کے اس کا شریک حال ہوگیا۔ اب یہ دونوں فوجیں مل کر ترکان خاتون کے مقابلہ کے لیے تیار ہوئیں۔ ترکان خاتون نے بھی اصفہان سے برکیارق کا تعاقب کیا اور مقام بروجرد میں دونوں فوجوں کا سخت مقابلہ ہوا۔ ہفتوں لڑائی ہوتی رہی لیکن ترکان خاتون کی فوج سے کئی امیر مثلاً امیر یلبرد، امیر کمشتگین جاندار وغیرہ مع اپنے فوج کے دستہ کے برکیارق کی فوج سے جاکر مل گئے جس کی وجہ سے خاتون کو شکست ہوئی۔ اور آخرکار وہ مع اپنی فوج کے واپس آکر اصفہان میں قلعہ بند ہوگئی۔

برکیارق نے کئی مہینہ تک اصفہان کا محاصرہ رکھا۔ لیکن فتح نہ ہوسکا اس لیے محاصرہ اٹھاکر انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی اور اس میں مصروف ہوا۔

ترکان خاتون نے موقع پاکر امیر اسمٰعیل کے ساتھ جو برکیارق

کا حقیقی ماموں تھا نکاح کر لیا اب ترکان امرار سرہنگ وساوتگین وغیرہ مع اپنی فوجوں کے ترکان خاتون کے طرفدار ہو گئے اور اس نے اپنی مستقل سلطنت اصفہان کے صوبے میں قائم کر کے اسمٰعیل کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ لیکن امیر انز سپہ سالار فوج نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ دربار خلافت سے اس کی اجازت نہیں ملی ہے۔ سکہ محمود کے نام کا اور خطبہ خلیفہ کے نام کا ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ سے امیر انز اور اسمٰعیل میں سخت عداوت پیدا ہوئی۔ آخر اسمٰعیل اس کے خوف سے بھاگ کر اپنی بہن زبیدہ کے پاس جو برکیارق کی ماں تھی اجازت لے کر چلا آیا۔

یہاں امرار اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز امیر تمشتگین جاندار وغیرہ نے تنہائی میں اس سے دریافت کیا کہ تم کس ارادے سے گئے ہو۔ اسمٰعیل نے کہہ دیا کہ میں اس ارادے سے آیا ہوں کہ موقع پاؤں تو برکیارق کو قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لوں یہ سن کر امرار نے اس کو قتل کر ڈالا جب اس کی بہن زبیدہ خاتون نے یہ کیفیت سنی تو وہ بھی چپ ہو رہی۔

۸۶ھ میں ترکان خاتون نے امیر انز کو فارس پر فوج کشی کے لیے بھیجا امیر موصوف نے حاکم فارس قوراشاہ کو شکست دے کر

وہ صوبہ بھی ترکان خاتون کے قلمرو میں شامل کیا۔

ترکان خاتون نے نہایت عزت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ برکیارق نے کئی بار اُس کو نیچا دکھلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی قابلیت اور بیدار مغزی سے برابر اس کا مقابلہ کرتی رہی۔ اس کے امراء جان و دل سے اس کے مددگار، مطیع و فرماں بردار تھے اور وہ نہایت ہر دلعزیز تھی۔

۴۸۷ھ میں اس نے اصفہان میں وفات پائی اور دہلی میں دفن کی گئی۔ جنازہ کے ساتھ دس ہزار ترکمانوں کی فوج تھی۔

تمام اطراف ملک میں اس نے مسجدیں۔ مدرسے اور شفاخانے بنوائے تھے۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کو یاد کر کے لوگ اسکا ماتم کرتے تھے۔

شجرۃ الدر

شجرۃ الدر ترکی قوم کے ایک غریب غلام کی لڑکی تھی اور ملک شام کے شہر دمشق میں سنہ ۶۳۱ھ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا آقا ایک نیک نہاد شامی مسلمان تھا جو بڑا عبادت گزار خدا پرست اور علم دوست تھا۔ اسی کے گھر میں شجرۃ الدر کے والدین اور خود اس کی تربیت ہوئی۔

شام کا ملک حسن کے لحاظ سے دنیا میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں پیدا ہوئے تھے اور اب بھی وہاں کا حسن دنیا میں بے نظیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شجرۃ الدر جو ایک ترک غلام کی لڑکی تھی خدا نے اس کو بے مثل حسن صورت عطا کیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کا نام شجرۃ الدر (شاخ مرجان) رکھا گیا

اس کا آقا جو لاولد تھا اس کو بمنزلہ اپنی لڑکی کے سمجھتا تھا اور بڑی محبت کے ساتھ پالتا تھا۔ جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کو عربی زبان کی صرف نحو اور قرآن و تفسیر اور حدیث و فقہ کی تعلیم دی۔ قرأت بھی سکھائی۔ اب اس کی لیاقت علمی اور حسن ظاہری کا بڑا شہرہ ہوا۔ ایوبی خاندان کے ملک کامل محمد کا زمانہ تھا وہ بھی اس زمانے میں

دمشق میں موجود تھے۔ اُن کے بیٹے شاہزادہ نجم الدین ایوبی نے جب شجرۃ الدرّ کا ذکر سُنا تو اس کے آقا کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ شجرۃ الدر ہم کو دیدیں۔ نیک دل آقا جو اس کی ہر وقت بھلائی چاہتا تھا بہت خوش ہوا اور اسے منظور کر لیا۔ شاہزادہ نجم الدین نے اس کی قیمت میں کئی تھیلیاں اشرفیوں کی بھجوائیں۔ بڈھا اُن کو منظور نہیں کرتا تھا۔ مگر جب شاہزادے نے مفت لینے سے انکار کیا تو مجبوراً اس کو قیمت لینی پڑی۔

اب شجرۃ الدر جس نے ایک غریب مگر نیک اور بہت شریف مسلمان کے جھونپڑے میں پرورش پائی تھی قسمت کی یاوری سے بادشاہِ وقت کے محل سرا میں آئی جہاں نعمت و دولت کی انتہا نہ تھی اور ہر قوم کی بیگمات ایک دوسرے سے بڑھ کر موجود تھیں مگر شجرۃ الدر جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ تمام بیگمات میں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے تاروں میں چاند۔

ملک کامل محمد نے جب اس کو دیکھا اور حسن ظاہری علمی لیاقت اور عقل و شعور میں کامل پایا تو اپنے بیٹے سے کہا کہ اس کو آزاد کرو اور پھر اسی کے ساتھ بڑے دھوم دھام سے شاہزادہ کی شادی کر دی۔

شجرۃ الدر کو اللہ تعالےٰ نے بہت سے مردوں سے زیادہ عقل دی تھی۔ بہت ہی تھوڑے عرصے میں وہ اپنی عقلمندی کے سبب سے

محل میں سب سے زیادہ ممتاز اور معزز ہو گئی اور ملک صالح نجم الدین کو اس پر بہت اعتماد ہو گیا۔ اس سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا جس کا نام ملک خلیل رکھا گیا۔

ملک کامل محمد کی وفات کے بعد جب ملک صالح نجم الدین بادشاہ ہوا تو شجرۃ الدر بوجہ اپنی عقلمندی کے اس کا دست بازو بن گئی اور تمام ملکی معاملات میں حصہ لینے لگی۔ یہاں تک کہ مدت کے فتنہ و فساد کی وجہ سے ملک شام میں جو خرابیاں پڑ گئی تھیں اس کے صلاح و مشورہ سے سب رفع ہو گئیں۔ ملک میں امن اور رفاہیت ہوئی اور ساری رعایا خوشحال ہو گئی۔

جب ملک شام کا انتظام حسب دل خواہ ہو گیا تو ملک نجم الدین اپنے دارالخلافہ قاہرہ (مصر) میں آیا اور وہاں کا انتظام شروع کیا اس زمانے میں فرانسیسیوں کے حملے برابر مصر پر رہتے تھے ملک صالح نے ایک جرار لشکر ترتیب دیا اور اس کو لے کر فرانسیسیوں کے مقابلے کے لئے نکلا۔ اس کی عدم موجودگی کے زمانے میں شجرۃ الدر سلطنت کے تمام کاروبار کی خود مختار حاکم تھی۔ وہ نہایت دوراندیش اور عقلمند عورت تھی اس نے ایسا امن و امان قائم رکھا کہ تمام ملک میں کہیں کوئی فتنہ فساد نہیں کھڑا ہوا۔ ساری رعایا اور امراء و وزراء اس سے خوش تھے۔

ملک صالح نے بہت سے غلام خریدے تھے ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ شہر میں کبھی کبھی یہ غلام دنگا فساد بھی کیا کرتے تھے۔ شجرۃ الدر نے جب اس کی شکایت سنی تو اس نے مقیاس کے قریب ایک قلعہ بنوایا اس میں ان سب غلاموں کو رکھا اور شہر میں پھرنے کی ممانعت کر دی اور کئی سو کشتیاں تیار کرائیں۔ اور ہر قسم کے بحری جنگ کے ہتھیار مہیا کئے اور ان غلاموں کو بحری لڑائی سکھلائی تاکہ جب فرانسیسی حملہ کریں تو یہ ان کا مقابلہ کر سکیں۔

سنہ ۶۴۶ھ میں ملک صالح نجم الدین کے چہرہ پر ایک پھوڑا نکلا ہر چند اس کا علاج کیا گیا لیکن وہ اچھا نہ ہوا بلکہ برابر بڑھتا گیا اسی زمانے میں ایک فرنچ جنرل جس کا نام ریدا تھا۔ دو سو جنگی کشتیاں لے کر دمیاط کی سرحد پر آ پہنچا۔

یہ فرانسیسی سپہ سالار مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اندلس کے مسلمانوں پر بڑے بڑے ظلم کئے تھے اور ان کا سارا مال لوٹ لیا تھا۔ اب ایک بھاری فوج لے کر مصر کو لوٹنے کے لئے آیا۔ دمیاط میں پہنچ کر اس پر حملہ کیا۔ وہاں کے غریب مسلمان اپنے بال بچوں کو لے کر بھاگ گئے اور سارا شہر اس کے لئے خالی چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان میں اس کے مقابلے کی بالکل طاقت نہ تھی۔

شجرۃ الدر نے جب سُنا تو اس کو بہت تردد ہوا کیونکہ ملک صالح سخت بیمار تھا۔ لیکن عالی حوصلہ بادشاہ نے باوجود اس تکلیف دہ مرض کے اس سے لڑنے کی تیاری کی اور بے شمار فوج لے کر دمیاط کی طرف روانہ ہوا۔ خود ایک محافہ میں سوار تھا کیونکہ اس میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ بیٹھ سکتا۔

دمیاط کی سرحد میں پہنچ کر فرانسیسیوں سے سخت مقابلہ ہوا اور بے شمار فرانسیسی مارے گئے۔ آخر ریدا مجبور ہو کر بھاگ گیا۔

ملک صالح کامیاب واپس آیا لیکن اس کی بیماری بڑھتی جاتی تھی اور آخر ۱۴ شعبان المعظم ۶۴۷ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

اس سے ایک سال پہلے ملک صالح کا بیٹا ملک خلیل جو شجرۃ الدر سے پیدا ہوا تھا مر گیا تھا۔ ایک دوسرا بیٹا توران شاہ دوسری بیوی سے تھا وہ اس وقت کیفا کے قلعہ میں تھا جو مصر سے فاصلے پر ہے اور ملک شام میں واقع ہے

ملک صالح کی وفات کے بعد شجرۃ الدر نے یہ عقلمندی کی کہ اس کی موت کی خبر کو شائع نہ کیا۔ کیونکہ اس کو خیال تھا کہ اس کی وفات کی خبر سُن کر فرانسیسی پھر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ روزانہ اطبا محل میں آتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ملک صالح ابھی زیر علاج ہے اور تمام کاروبار

اسی طرح شجرۃ الدر انجام دیتی تھی جس طرح اس کی بیماری کے زمانے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی کہ بادشاہ مرگیا ہے۔

امیر حسام الدین لاچین اور امیر فارس الدین اقطائی دونوں وزیر اس معاملے میں شجرۃ الدر کے ہمراز تھے اور کوشش کرتے تھے کہ یہ راز کسی طرح افشا نہ ہو۔

تورانشاہ ایک سخت مزاج شاہزادہ تھا۔ اس نے اپنے باپ کے تمام ملازموں کو برطرف کیا اور اپنے غلاموں کو ان کے بجائے مقرر کیا تمام رعایا داعیانِ ملک اس سے ناراض ہوگئے۔ جب یہ خبریں فرانس میں پہنچیں تو ریدا پھر ایک عظیم الشان جنگی بیڑا لے کر پہنچا اور دار سکور پر حملہ کیا۔

شجرۃ الدر کو یہ خبر سن کر بہت فکر ہوئی کیونکہ تورانشاہ کسی کام کا آدمی نہ تھا اس نے امیر حسام الدین لاچین اور امیر بیبرس بندقداری کو بلا کر کہا کہ جس قدر تم سے فوج جمع ہو سکے جمع کر کے لے جاؤ اور دشمن کو ملک سے نکال دو۔

اس کے فرمان کے مطابق ان دونوں امیروں نے لشکر جمع کیا تورانشاہ نے جب دیکھا کہ لشکر جمع ہو گیا تو وہ خود بھی چلنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور بڑے کروفر سے یہ اسلامی لشکر چلا۔ بہادر لاچین تے پہنچے

کے ساتھ ہی فرانسیسیوں پر ایک بیدریغ حملہ کیا جو قیامت کا نمونہ تھا۔ ۶۷ مسلمان امرار اس معرکہ میں شہید ہوئے۔ سپاہیوں کی کچھ گنتی نہیں تقریباً تیس ہزار فرانسیسی مارے گئے اور آخرکار ریدا گرفتار کرلیا گیا۔

توران شاہ کی سلطنت ایک سال رہی اور اس کے بعد جب اس نے زیادہ مظالم کرنے شروع کئے تو ملک صالح کے چند غلاموں نے اس کو مار ڈالا۔ اس کے مرنے پر ایوبی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس کے قتل کے بعد تمام امرار اور اعیان سلطنت نے مشورہ کرکے شجرۃ الدر کو ۲ صفر ۶۴۹ھ میں تخت پر بٹھایا۔ تمام قاہرہ کی آئین بندی کی گئی اور بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کیونکہ اس کے عدل و انصاف سے تمام ملک مصر خوش تھا اور اس کی عقل اور دور اندیشی پر سب کو اعتماد تھا۔

شجرۃ الدر ترکی عورت تھی اس کے مزاج میں حلم و متانت خودداری اور وقار بدرجۂ کمال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا رعب بہت تھا۔ وہ ہمیشہ پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر دربار کرتی تھی۔ اور بڑے بڑے امرار اور وزرار اس کے سامنے جاتے تھے تو دور ہی سے زمین بوسی کرتے تھے اس کا وزیر عزالدین ایبک ایک نہایت لائق ترک تھا۔

شجرۃ الدر نے سب سے پہلے یہ کام شروع کیا کہ بحری فوج باقاعدہ

مرتب کی تاکہ ملک بیرونی حملوں سے محفوظ ہے۔ امرار اور اعیانِ سلطنت کو اس نے اپنی فیاضی سے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور تمام ملک میں وہ ہر دل عزیز ہو گئی۔ یہاں تک کہ مسجد کے ممبروں پر اس کے لئے دعا ہونے لگیں۔ وہ ہر ایک کام سلطنت کا اپنے پیش نظر رکھتی تھی ممکن نہ تھا کہ عزالدین ایبک بلا اس کے مشورہ کے کوئی کام کرے۔ فرمانوں پر اس کا دستخط یہ ہوتا تھا "والدہ خلیل"

ابھی اس کی سلطنت کو صرف تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ خلیفہ بغداد ابو جعفر مستنصر باللہ کے پاس خبر پہنچی کہ مصر والوں نے ایک عورت کو اپنے اوپر حاکم بنا لیا ہے۔ انھوں نے امرار مصر کے نام ایک خط بھیجا اور اس میں لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے ایک عورت کو اپنے اوپر حاکم بنا لیا ہے۔ کیا ملک مصر میں کوئی مرد نہیں جو حکومت کر سکے۔

یہ خط جس وقت مصر میں پہنچا تو شجرۃ الدر نے اسی وقت نہایت خوشی کے ساتھ سلطنت چھوڑ دی۔ مصر کے لوگوں کو اس کا سلطنت چھوڑنا نہایت شاق گذرا۔ آخر انھوں نے یہ صورت نکالی کہ شجرۃ الدر کی شادی عزالدین ایبک کے ساتھ کر دی اور عزالدین ایبک کو تخت پر بٹھایا اسی وقت سے مصر میں ترکی خاندان کی حکومت شروع ہو گئی۔

افسوس کہ شجرۃ الدر کا خاتمہ نہایت دردناک ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اس کی لونڈیوں نے کسی خاص وجہ سے اس کے شوہر عزالدین ایبک کو حمام میں قتل کر دیا۔ اسی عداوت سے ۱۰ ربیع الاول ۶۵۵ھ کو اس معزز ملکہ کو عزالدین ایبک کی دوسری بیوی نے مروا ڈالا اور قلعہ کے اوپر سے خندق میں پھنکوا دیا۔

تین دن کے بعد اس کے غلاموں نے اس کی نعش کو تلاش کر کے حضرت سیدہ نفیسہؒ کے مزار مقدس کے پاس دفن کر دیا۔

کجا ایک غلام کی لڑکی اور کجا تخت شاہی اور پھر یہ انجام!!

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

رضیہ سلطانہ

ایشیائی تاریخ کے مرقع میں رضیہ سلطانہ وہ دلچسپ اور خوشنما تصویر ہے۔ جس کو ملکہ ہند کی اولیت کا تمغہ مل چکا ہے یہ نوجوان حسین ملکہ بلا شرکت غیرے محض اپنی خداداد قابلیت حسن تدبیر اور زور بازو سے تخت ہند پر نہایت جاہ وجلال سے جلوہ گر ہوئی۔ اس سلطانہ کے سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اناث میں بھی بعض بعض بیگمات دلیری، عزم ثبات، جہانبانی، رائے و تدبیر میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہوئیں۔

رضیہ سلطانہ ۱۲۳۶ء میں تخت ہند پر بمقام دہلی اپنے بھائی کی جگہ متمکن ہوئی۔ باپ کا نام سلطان شمس الدین التمش تھا۔ یہ علاوہ حسن وجمال ظاہری کے اکثر علوم میں دستگاہ رکھتی تھی، اپنے مذہب کی بے حد پابند تھی۔ قرآن شریف روزانہ نہایت ادب سے تلاوت کرتی۔ شاعری سے بھی ذوق تھا شعر بھی کہتی۔ تخت سلطنت پر مردانہ لباس میں بے نقاب بیٹھتی۔ خود مقدمات فیصل کرتی۔ تمام فرامین اس کے قلم سے جاری ہوتے۔ سلطنت کی جزو کل کی خود نگرانی کرتی

میدان جنگ میں اپنی فوج کی سپہ سالار بنتی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے قسمت کی اچھی نہ تھی۔ اس سے ایک غلطی ہو گئی جس کے طفیل میں اس کو سلطنت کے ساتھ اپنی جان عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

جب یہ تخت پر بیٹھی ہے تو نظام میں سخت ابتری تھی۔ ارکان سلطنت خود سر تھے۔ قواعد وضوابط شمسی کا دیباچہ الٹ چکا تھا مگر اس نے اپنی خداداد قابلیت اور حسن تدبیر سے تمام خرابیوں کی بیخ کنی کرکے فتنہ و فساد کی آگ کو فرد کر دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے جب گوالیار کو فتح کرکے دہلی کی طرف مراجعت فرمائی تھی تو رضیہ کو اپنا ولی عہد کیا تھا۔ امرار دربار نے عرض کیا کہ شاہزادوں کے ہوتے لڑکی کے ولی عہد کرنے میں کیا حکمت ہے؟ تو سلطان نے جواب دیا کہ میرے فرزند لہو و لعب اور لغویات میں مبتلا ہیں۔ وہ سلطنت کی قابلیت نہیں رکھتے۔ رضیہ اگرچہ عورت ہے لیکن حقیقت میں مرد ہے۔

یہ اپنے باپ کے وقت میں مہمات ملکی کو انجام دیتی تھی۔ بادشاہ اس کی صلاح و مشورہ بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا جب سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا تو ۶۳۳ھ میں بعض ارکین سلطنت کے اغوا سے فیروز شاہ تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ اور تخت پر بیٹھتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس

کو بھانڈوں اور مسخروں سے فرصت نہیں تھی سلطنت کے کام کو کون سنبھالتا
تمام خزانہ بیہودہ لوگوں میں صرف کر دیا اور سلطنت کے کاروبار کو اپنی
ماں کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ وہ بے حد سنگدل اور ظالم تھی۔ اس نے قابو
پاتے ہی سلطان شمس الدین التمش کی تمام بیواؤں کو نہایت عذاب سے قتل کیا۔
حتیٰ کہ سلطان کے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو بھی مار ڈالا۔

آخر کار ان بے گناہوں کا خون رنگ لایا اور چھوٹے بڑے سب
فیروز شاہ سے ناراض ہو گئے۔ شاہزادہ غیاث الدین نے بغاوت کر کے
خزانہ شاہی کو لوٹ لیا۔ اور نامی نامی سرداروں سے سازش کر کے دہلی کا
قصد کیا۔ فیروز شاہ نے بھی فوج لے کر چڑھائی کی۔ سردار چونکہ فیروز شاہ
سے بد دل تھے سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ملکہ رضیہ کب چوکنے والی تھی
امرار کو متفق کر کے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ
کو فریقین میں ایک سخت معرکہ ہوا۔ فیروز شاہ گرفتار ہو کر جیل خانے میں گیا
اور چند دن کے بعد فوت ہو گیا۔

جن سرداروں نے اس کو تخت سلطنت پر بٹھایا تھا اب وہ دوسرے
شاہزادہ کی تخت نشینی کے درپے ہو گئے۔ ایسی حالت میں ایک کم سن
عورت کا تخت ہند پر بیٹھ کر سلطنت کو سنبھال لینا کوئی آسان کام
نہ تھا۔ اس بہادر ملکہ نے اپنی حکمت عملیوں سے سب کو زیر کر کے

رعب و داب کا سب کے دلوں پر جما دیا۔

سنہ ۶۳۷ھ میں اعز الدین حاکم لاہور نے بغاوت کی جس کی سرکوبی کے لیے خود ملکہ نے فوج کشی کی اور اس فوج کی خود سپہ سالار بنی۔ اس کا ارادہ تھا کہ باغی کو مقہور کر کے سلطنت کا دورہ بھی کر لوں گی اور جو خرابیاں کہ سلطنت میں باقی رہ گئی ہیں ان کا تدارک بھی قرار واقعی ہو جائے گا۔ جب ملکہ حدود لاہور میں پہنچی۔ حاکم لاہور بجز اطاعت کے چارہ کار نہ دیکھ کر حاضر ہو گیا۔ اس کی خطا بخشی کی اور ملتان کا صوبہ بھی اس کی گورنری میں شامل کر دیا۔ ہنوز کامل طور سے ملکہ کو اس خرخشے سے نجات نہیں ملی تھی کہ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے یاقوت حبشی (جس کو اس کی حسن خدمات کے صلے میں امیر الامرا کا خطاب ملا تھا) کی زیادتیوں سے تنگ آ کر بغاوت کر دی۔ ملکہ نے اس کی سرکوبی کے واسطے بھی خود سپہ سالار ہو کر بے شمار فوج کے ساتھ چڑھائی کی سرداران فوج نے جو کہ یاقوت حبشی کے امیر الامرائی کے عہدے سے ناراض تھے موقع پا کر یاقوت حبشی کو قتل کر کے ملکہ کو قلعہ بھٹنڈہ میں نظر بند کر دیا اور دہلی جا کر معز الدین بہرام شاہ کو تخت نشین کیا۔

رضیہ سلطانہ قید کی حالت میں بھی نچلی نہ بیٹھی۔ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ سے عقد کر کے دہلی کے واسطے پھر قسمت آزمائی کی۔ مگر تقدیر پلٹ چکی تھی کچھ پیش نہ گئی۔ دوبارہ پھر مقابلہ کو نہایت زور شور سے

بھی۔ چند امرار دربار کو گانٹھ لیا۔ اور جاٹوں کا لشکرلے کر مقابلہ کیا۔ بہرام شاہ کی طرف سے اعزالدین بلبنی جو سلطان شمس الدین التمش کا داماد اور جس کا خطاب الف خاں تھا۔ مقابل ہوا۔ نواح کیتل میں ایک سخت خونریز لڑائی کے بعد ملکہ کو شکست ہوئی۔ اگرچہ ملکہ مع اپنے شوہر کے فوج کے ہمراہ تھی اور جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ مگر قسمت کے آگے کچھ بس نہ چلا۔ شکست فاش کھائی۔ اور بھاگتے وقت گرفتار ہوکر ۲۵ ربیع الاول کو مع اپنے شوہر کے قتل کردی گئی۔

مدت سلطنت ۳ سال ۶ ماہ اور ۶ روز ہے۔ نئی دہلی کے محلہ بلبلی خانے میں منشی شیر علی خاں اور جناب مولوی رشید الدین خاں صاحب کے مکانات کے ایک سنگین احاطہ میں دفن ہے۔ اس احاطہ میں دو قبریں ہیں۔ ایک رضیہ سلطانہ اور دوسری سجیعہ بیگم کی عوام الناس اس کو رجی ججی کی درگاہ بھی کہتے ہیں۔ مکان بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اور قبروں کے تعویذ بھی دستبرد زمانہ سے ثابت نہیں فاعتبروا یا اولی الابصار

چاند بی بی

چاند بی بی جس کی سیاسی کاردانی اور جرأت و ہمت کے افسانے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے لئے مایۂ فخر ہیں حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی اور علی عادل شاہ اول بیجاپور کی ملکہ تھی۔ اس کا سن ولادت ۱۵۴۷ء ہے۔ بچپن کا زمانہ احمد نگر میں گزرا۔ اس کی والدہ خدیجہ سلطانہ نے اس کی نہایت اعلیٰ درجے کی تربیت کی اور اسی تربیت کا فیض تھا کہ چاند بی بی نے ان تمام کمالات میں دستگاہ کافی بہم پہنچائی جو شاہی خواتین کے لئے باعثِ زینت ہو سکتے ہیں۔

علی عادل شاہ اول بیجاپور کا عہد حکومت ۱۵۵۷ء سے ۱۵۸۰ء تک رہا۔ ۱۵۶۴ء میں عادل شاہی اور نظام شاہی فرماں رواؤں کی باہمی ناچاقیوں کا انسداد ہوگیا اور اس رشتۂ اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے والی احمد نگر نے چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کر دی۔ شولاپور کا قلعہ چاند بی بی کے جہیز میں دیا گیا۔ چاند بی بی اپنے شوہر کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ امورِ سلطنت میں عادل شاہ کی مشیر خاص تھی۔ اس کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہوکر

فوجی قواعد کا معائنہ کرتی تھی۔ اور بعض اوقات میدانِ جنگ میں بھی اس کی شریک کار رہتی تھی۔

۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ نے وفات پائی اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاولد بیگم چاند بی بی امور سلطنت کی منتظم ٹھہری علی عادل کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل جو تاج و تخت کا وارث تھا۔ چاند بی بی کے زیر سایہ پرورش پانے لگا۔ چاند بی بی نے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا اور قلمدانِ وزارت کامل خاں کے سپرد کیا۔ یہ شخص بیجاپور کا ایک لائق اور بارسوخ امیر تھا۔ علی عادل شاہ نے بیجاپور کو دکن کی اسلامی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقت ور بنا دیا تھا، اور اس کے عہدِ حکومت میں رعایا نہایت آسودہ و مرفہ الحال رہتی تھی۔

چاند بی بی کا مقصد یہی تھا کہ اپنے نامور شوہر کے عہد حکومت کی روایات کو برقرار رکھے۔ چہارشنبہ اور جمعہ کے علاوہ وہ ہر روز قلعہ میں دربار کرتی تھی صغیر سن بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا اور وہ پس پردہ موجود رہتی تھی۔ وہ رعایا کی دادرسی کی پوری کوشش کرتی تھی۔ امرائے حکومت کو اس نے یہ حکم دیا تھا کہ خوشامد سے باز رہیں اور ہر موقع پر اپنی سچی رائے ظاہر کر دیں۔ نہمات امور کا فیصلہ امرا کی کثرت رائے سے ہوتا تھا

کامل خاں جس کو اپنی قابلیت پر ناز تھا۔ چاند بی بی کی خودمختاری کا سدباب کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سازش کا راز منکشف ہو گیا اور چاند بی بی نے اُس کو وزارت سے علیحدہ کر دیا۔

کشور خاں جو ایک نہایت جری اور تجربہ کار امیر تھا۔ کامل خاں کا جانشین مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نے بھی چاند بی بی سے مخالفت شروع کر دی۔ جب چاند بی بی نے اس کو برطرف کرنے کا ارادہ کیا تو کشور خاں نے کھلم کھلا علم بغاوت بلند کر دیا اور پردہ نشین چاند بی بی اس الزام کے ساتھ ستارہ کے قلعہ میں قید کر دی گئی کہ وہ اپنے بھائی کو بیجاپور پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔ لیکن امرار حکومت چاند بی بی کے طرفدار تھے۔ انھوں نے اپنی متفقہ قوت سے کشور خاں کو خارج البلد کر دیا اور چاند بی بی کو ستارہ کے قلعہ سے چھڑا کر دوبارہ عنان حکومت اس کے سپرد کی۔ یہ واقعہ ۱۵۸۴ء کا ہے۔

کشور خاں کے قتل کے بعد وزارت کا منصب اخلاص خاں نامی ایک نہایت قابل حبشی نژاد امیر کو دیا گیا۔ لیکن بیجاپوری امرار کے دو فریق ہو گئے۔ ایک دکھنی اور دوسرا حبشی اور اب ان کے روز افزوں باہمی تنازعات سلطنت کے حق میں نہایت مضر ثابت ہونے لگے۔

بیجاپور کی ابتر حالت دیکھ کر ہر چہار طرف سے مخالف حکومتوں نے

سر اٹھانا شروع کیا۔ اور برار، بیدر، اور گولکنڈہ والوں نے سلطنت کی حدود میں اپنے قدم بھی بڑھانے شروع کر دیئے۔ مگر چاند بی بی نے وہ داد شجاعت دی کہ وہ تمام مخالفانہ کوششیں ناکام رہیں اور سلطنت بیجاپور کا شیرازہ منتشر نہ ہو سکا۔

۱۵۸۵ء میں چاند بی بی کے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ بیگم سے شادی کی۔ اور اس طرح نظام شاہیوں اور عادل شاہیوں میں جدید رشتہ قائم ہو گیا۔ چاند بی بی نے اب امور سلطنت سے دست بردار ہو کر بقیہ عمر یاد الٰہی میں صرف کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بھاوج کے ساتھ اپنے میکے چلی آئی۔

احمد نگر میں چاند بی بی کو نہایت دلخراش واقعات کا سامنا کرنا پڑا مرتضیٰ نظام شاہ اور اس کا بیٹا میران آپس میں برسرپیکار تھے۔ آخر مرتضیٰ نظام شاہ مقتول ہوا۔ میران کو تخت نشین ہوئے۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ امراء نے اس کو قتل کر کے مرتضیٰ نظام کے بھتیجے کو تخت پر بٹھایا۔ مگر بیجاپور اور برار سے اس تقرر کی مخالفت ہوئی اور اگر چاند بی بی کے اثر سے صلح نہ ہو جاتی تو شاید احمد نگر تباہ ہو جاتا۔

اس تمام خانگی فساد میں چاند بی بی کی متواتر یہی کوشش رہی کہ مصالحت ہو جائے، لیکن اس کی کوشش بے سود رہی اور اس

کو پے در پے صدمے اُٹھانے پڑے۔ آخر کار وہ بیزار ہو کر بیجا پور چلی آئی ابراہیم عادل شاہ نے اپنی چچی کا نہایت تپاک سے استقبال کیا۔ چاند بی بی کے چلے آنے کے بعد احمد نگر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور آپس کی ناچاقیوں کی وجہ سے اکبر کو مداخلت کا موقع مل گیا۔

صورت حال یہ تھی کہ امرا دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک جماعت جس کے سرگروہ میاں منجو تھے احمد شاہ کی طرف دار تھی۔ دوسری جماعت بہادر شاہ کو تخت نشیں کرنے کے درپے تھی یہ دونوں شہزادے صغیر سن بچے تھے۔ میاں منجو نے اپنی مدد کے لئے شہزادہ مراد کو جو گجرات میں تیس ہزار فوج کے ساتھ مقیم تھا بلایا۔ جب شہزادہ مراد احمد نگر کے بالمقابل کھڑا ہوا تو میاں منجو کی آنکھیں کھلیں۔ امرا نے مشورہ کر کے طے کیا کہ سلطنت کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو چاند بی بی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔

ایک بارسوخ جماعت بیجا پور گئی اور عرض معروض کی۔ چاند بی بی اپنے خاندان کی لاج رکھنے کے لئے سینہ سپر ہو گئی۔ اس وقت اس کا سن پچاس سال کا تھا۔ لیکن اس کا جوہر شجاعت زندہ تھا اس لئے دونوں شہزادوں کو اپنی نگرانی میں لے کر منجو کو گولکنڈہ اور بیجا پور روانہ کیا کہ وہاں سے امداد حاصل کرے اور خود احمد نگر کے استحکام اور مورچہ بندی

میں مصروف ہو گئی۔

ان کارروائیوں سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ ۱۵۹۵ء میں شہزادہ مراد نے احمد نگر کو محصور کر لیا۔ اور کمال سرگرمی کے ساتھ احمد نگر کو تسخیر کرنے کی تدابیر اختیار کرنے لگا باہمت چاند بی بی نے مراد کی تدبیروں اور کوششوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا اور جب یہ خیال کیا جائے کہ اس وقت احمد نگر کی حالت کس قدر خستہ و خراب تھی تو چاند بی بی کے عزم تدبیر کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

ایک دن جبکہ شہنشاہی فوج نے سرنگ کے ذریعے سے قلعہ کی دیوار میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ چاند بی بی سبز برقعہ اوڑھ کر شمشیر بکف اس جگہ آن کھڑی ہوئی اور مغرب تک نہایت بیباکی کے ساتھ شہنشاہی فوج کے حملوں کو دفع کرتی رہی۔ آخر کار شہزادہ مراد نے تسخیر سے مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے بعض معزز سرداروں کو چاند بی بی کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ اس کی بہادری کی ثنا کریں اور اس کی جنگی کامیابیوں پر اس کو مبارک باد دیں اور اکبر کی طرف سے چاند بی بی کو چاند سلطانہ کا خطاب عطا کیا گیا۔ لیکن امرار کے مشورہ سے چاند بی بی کو برار کا علاقہ اکبر کی نذر کرنا پڑا اور اس طرح اس باحوصلہ اور کارداں خاتون نے اپنے آباؤ اجداد کے ملک کو اکبری کشورستانی کے سیلاب سے

بچالیا۔ صلح کے بعد چاند سلطانہ نے ابراہیم عادل شاہ کی مدد سے بہادر نظام شاہ کو وارث تاج و تخت قرار دیا۔ اور انتظام مملکت میں مصروف ہوگئی۔

۱۵۹۷ء میں شہزادہ مراد کا انتقال ہوگیا اور اکبر نے تسخیر دکن کے لئے شہزادہ دانیال کے زیر حکم ایک زبردست لشکر روانہ کیا۔ شہزادہ کے ہمراہ خان خاناں، راجہ علی خاں، راجہ جگناتھ وغیرہم تجربہ کار اور جنگ آزمودہ افسر تھے۔ چاند بی بی نے اکبری فوج کا رُخ دیکھ کر سہیل خاں نامی ایک مشہور سپہ سالار کو بیجاپور سے بلایا۔ ابوالفضل نے احمد نگر کے دوسرے محاصرہ کی مفصل کیفیت لکھی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنیوں نے اپنا خون پانی ایک کر دیا تھا اور چاند بی بی نے بھی حسب معمول داد جواں مردی دی تھی۔ لیکن تعداد اور ساز و سامان میں فائق ہونے کے باعث انجام کار مغلوں کی فتح ہوئی۔

۱۵۹۹ء میں نہنگ خاں نے بے سبب بیڑ کی مغلیہ فوج پر حملہ کر دیا۔ اکبر کو خبر ہوئی تو نہایت برافروختہ ہوا اور شہزادہ دانیال اور خانخاناں احمد نگر کو بالکل مٹا دینے کے کام پر مامور کئے گئے۔ چاند بی بی بھی خفا تھی اور گو وہ اپنے آبائی ملک کو بلا لڑے ہوئے اغیار کے حوالے کر دینے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی لیکن اس کے شامل رہنے سے اندرونی دشمنوں کی بن آئی۔ حمید خاں نامی ایک سردار جو چاند بی بی کا معتمد علیہ

اور احمد نگر کا سپہ سالار تھا۔ چاند بی بی کے متبنیٰ عباس خان سے سخت عداوت رکھتا تھا جس کو چاند بی بی اپنا حقیقی بیٹا سمجھتی تھی۔

الغرض حمید خاں کو بلا کر چاند بی بی نے وہ خط دکھلایا جو اس نے مغلیہ سپہ سالار کو لکھا تھا اور اس کی رائے دریافت کی۔ حمید خاں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ چاند بی بی کے ہاتھ سے خط لے کر باہر آیا اور امرائے سلطنت کے سامنے بآواز بلند کہا کہ "دغا! دغا!" اور وہ خط بھی پڑھ کر سُنایا۔ حمید خاں کا افسوں کارگر ہوگیا۔ ہر شخص یہ سمجھ گیا کہ چاند سلطانہ مغلوں سے مل گئی ہے اور ہم سے دغابازی کر رہی ہے۔ حمید خاں ایک زبردست جماعت کو ساتھ لے کر محل میں گھس پڑا۔ چاند بی بی نے اپنا اچھا بچاؤ کیا۔ مگر حمید خاں نے اس کا سر اُتار ہی لیا۔

عباس خاں اس وقت حاضر نہ تھا جب اس کو خبر پہنچی تو دیوانہ وار دوڑتا ہوا آیا اور قاتل کا نام پوچھ کر حمید خاں کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا عباس کی تلوار نے چاند بی بی کے بےرحم قاتل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پسرانہ محبت کی بھڑاس نکالی۔

چاند سلطانہ ایک زبردست شہسوار اور ایک جری و دوراندیش سپہ سالار تھی۔ بارہا اپنے شوہر کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد میدانِ جنگ میں گئی۔ فوجوں کا انتظام کرتی تھی۔ رموزِ جنگ بتلاتی

تھی جب سپاہی افسردہ دل ہو جاتے تو ہمت دلا دلا کر لڑاتی تھی فن حرب کے علاوہ متعدد زبانوں کی ماہرہ تھی۔ فارسی، عربی وغیرہ میں دستگاہ وافی رکھتی تھی۔ اور تلنگی، تامل، مرہٹی وغیرہ دکن کی مروجہ زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ وہ علم و فن کی بڑی قدر دان تھی ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی خواصوں میں ہر فن اور علم کی جاننے والی عورتیں رکھی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لوگ علی عادل شاہ کے عموماً دشمن ہو گئے تھے اور اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو قتل کر ڈالیں علی عادل شاہ باوجود اپنی دلیری کے متوحش تھا، اور تین روز سے برابر جاگ رہا تھا چاند بی بی نے اپنے شوہر کو دلاسا دیا اور اس کو باصرار سلا کر خود ہشیار رہی۔ اتنے میں بالاخانے پر کسی کے آواز آئی۔ یہ بہادر خاتون فوراً اپنے شوہر کی تلوار لے کر باہر نکل آئی اور دیکھا کہ دو شخص کھڑے ہیں فوراً اُن پر جھپٹ پڑی اور پہلے ہی حملے میں ایک کا سر اُڑا دیا اور دوسرے حملے میں ایک کو سخت زخمی کر ڈالا۔ اس شور سے علی عادل شاہ جاگ پڑا۔ باہر آ کے دیکھا تو چاند تلوار لئے کھڑی ہے۔ شوہر کو دیکھ کر چاند بی بی نے کہا کہ لیجئے یہ آپ کے دونوں مہمان ہمیشہ کے لئے آپ سے جُدا ہو گئے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ چاند بی بی محافہ میں احمد نگر سے بیجاپور آ رہی تھی۔ ساتھ صرف ایک مختصر سا باڈی گارڈ تھا۔ چاند بی بی کے ہمراہی سپاہیوں اور حکومت گولکنڈہ کی سپاہ میں کہیں راہ میں تنازعہ ہو گیا اور جدال و قتال تک نوبت پہنچی۔ چاند بی نے دیکھا کہ میرے ہمراہی تعداد میں بہت کم ہیں تو فوراً محافہ سے نکل پڑی اور اپنے چیتل گھوڑے پر سوار ہو کر مصروف پیکار ہو گئی اور مخالفین کو پسپا کر دیا۔

گلبدن بیگم

گلبدن بیگم سلطان ظہیر الدین محمد بابر سلاطین مغلیہ کے پہلے بادشاہ ہند کی جس کی رگوں میں وسط ایشیا کے دو بڑے جنگ جو اور مشہور خاندانوں یعنی ترکوں اور مغلوں کا خون رواں تھا، بیٹی تھی۔

اس کا باپ ۱۴۹۳ء میں بعمر ۱۲ سال مملکت فرغانہ کا وارث بنا لیکن خاندانی عداوت عزیزوں اور رشتہ داروں کی دست اندازی اور دوسرے وجوہات کے باعث دس برس تک اس کو کہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا بالآخر ۱۵۰۴ء میں وہ کابل کا بادشاہ ہو گیا۔

اس واقعہ کے ٹھیک ۱۹ برس بعد ۱۵۲۳ء میں دلدار بیگم کے بطن سے گلبدن متولد ہوئی۔ دلدار بیگم کے حسب نسب کا کتب تواریخ میں کہیں ذکر نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ شاہی خاندان سے نہ تھی تاہم شریف اور اعلیٰ خاندان سے ضرور تھی۔

دلدار بیگم کے بطن سے ۵ بچے پیدا ہوئے تھے۔ ۳ لڑکیاں گل رنگ گل چہرہ اور گلبدن اور ۲ لڑکے ہندال اور الور۔ بابر کا ایک مدت سے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ تھا اور جس وقت گلبدن بیگم پیدا ہوئی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول تھا۔ چنانچہ سرحد کے اکثر مقامات فتح کر لئے تھے جس وقت گلبدن بیگم کی عمر ۲½ سال کی تھی اس نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر شمالی ہندوستان کو اپنے زیر حکومت کر لیا تھا

بابر کے ہندوستان چلے آنے کے بعد اس کی چہیتی بیوی ماہم بیگم نے جو ولی عہد کی ماں ہونے کے باعث سب بیویوں میں زیادہ ممتاز اور بااثر تھی۔ گلبدن بیگم اور اس کے بھائی ہندال کو متبنّیٰ کر لیا اور اپنی زیر نگرانی اُن دونوں کی تعلیم و تربیت کرنے لگی۔ ماہم بیگم کے ان دونوں کو متبنّیٰ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے چار چھوٹے بچوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے بابر کو بھی اس کی دلجوئی منظور تھی۔ چنانچہ اس

نے بخوشی تمام اس امر کی اجازت دے دی

دلدار بیگم نے بجبر و اکراہ اپنے بچوں کی جدائی منظور کی ۔ ۱۵۲۷ء میں بابر نے تمام خاندان شاہی کو کابل سے ہندوستان آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ گلبدن بیگم بھی ماہم بیگم کے ساتھ سب قافلے سے آگے روانہ ہوگئی۔ گلبدن بیگم کے ہم سفر ہونے سے ماہم بیگم کا وہ رنج والم جو اس کو اپنے چھوٹے بچے فاروق کی وفات سے پہنچا تھا بہت کچھ دور ہوگیا۔ اور اس شش سالہ بچی کی پیاری اور دل لبھانے والی باتوں کی وجہ سے سفر کی تکالیف اور مصائب کچھ معلوم نہ ہوئے۔ جب یہ دونوں کول (علی گڑھ) پہنچے تو بابر نے آگرہ سے کئی پالکیاں اور بہت سے سوار استقبال کے لئے روانہ کئے اور بعد ازاں فرط محبت سے بے خود ہوکر سواری کا انتظار کئے بغیر خود بھی پیدل روانہ ہوگیا۔

آگرہ سے ۴ میل کے فاصلہ پر نوگرام میں ملاقات ہوئی۔ دوسرے روز ۲۷ فروری ۱۵۲۸ء کو آگرہ میں یہ سب لوگ وارد ہوئے۔ بابر کے کابل سے روانہ ہونے کے وقت گلبدن کی عمر ۱½ سال کی تھی۔ اب جبکہ اس کی عمر ۶ سال کی تھی وہ اپنے باپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ باپ نے بھی اُسے پیار کیا۔ گلے لگایا اور باتیں کیں۔ اس ملاقات کا ذکر گلبدن نے اپنی کتاب ہمایوں نامہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو خوشی و مسرت اس

کو اس وقت ہوئی تھی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔

آگرہ آنے کے چند دنوں بعد بابر ماہم بیگم اور گلبدن بیگم کو اپنے ہمراہ دھول پور لے گیا۔ جہاں اس چھوٹی بچی نے ہندوستان کے دل فریب مناظر کی سیر کی۔ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کے نازک دل پر صدمات کی پے در پے چوٹیں لگیں۔ اس کے بھائی الور کا انتقال ہوا۔ اس کے پیارے باپ بابر نے اس جہاں سے کوچ کیا۔

بابر کے انتقال کے بعد گلبدن بیگم کا بھائی ہمایوں تخت نشین ہوا گلبدن کے ساتھ اس کو حد درجہ محبت تھی۔ وہ تقریباً ہر روز اس سے ملنے کے لیے اس کے محل میں آیا کرتا تھا۔

۲۶ ر اپریل ۱۵۳۴ء کو ماہم بیگم بھی داغ مفارقت دے گئی۔ گلبدن کے دل پر اس واقعہ کا بڑا صدمہ ہوا کیوں کہ وہ اس کے ساتھ حقیقی ماں سے کچھ کم محبت نہ کرتی تھی اور نہایت مہربانی سے پیش آتی تھی۔

اب وہ زمانہ آیا کہ ہمایوں کا ستارۂ اقبال گردش میں آگیا۔ چوسہ پر اس نے شیر شاہ کے مقابلے میں شکست فاش کھائی۔ وہ وہاں سے آگرہ واپس آیا اور گلبدن بیگم سے امور سلطنت کے بارے میں مشورہ کیا۔ گلبدن کی عمر اس وقت ۱۷ سال کی تھی اور اس کی شادی خضر خواجہ خاں چغتائی مغل کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ہمایوں کے گلبدن سے مشورہ لینے سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس نو عمری کے زمانے میں بھی وہ امورِ مملکت سے کامل طور پر واقف اور نہایت صائب رائے رکھتی تھی۔

جب ہمایوں کو شکست پر شکست نصیب ہوئی تو کامران خاندان شاہی کی تمام بیگمات کو ایک بڑی فوج کے زیرِ حفاظت اپنے ہمراہ لاہور لے گیا گلبدن بیگم جس کو آگرہ سے ایک قسم کا اُنس ہو گیا تھا۔ یہ نہ چاہتی تھی کہ وہ اس مقام کو جہاں اُس نے اپنے بچپن کے خوش گوار ایام گزارے تھے چھوڑے۔ لیکن بالآخر ہمایوں کے کہنے سے راضی ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک نہایت باسلیقہ، باتمیز اور خوش مزاج بیگم تھی اور انھیں اوصافِ حمیدہ کے باعث اس کے سب بھائی اس سے کمال درجہ انس اور محبت کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ کامران اس کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ کامران کا مقصد اس کو اپنے ہمراہ لے جانے سے یہ ہو کہ اس کا شوہر خضر خواجہ بھی اس کا شریک ہو جائے

لاہور سے وہ اپنی ماں دلدار بیگم کے پاس چلی گئی جو اپنے لڑکے ہندال کے پاس ملتان میں تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ کابل کامران کے پاس گئی۔ کامران نے اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا اور وہ دوسری بیگمات کی طرح اس کے ظالم ہاتھوں ذلیل و خوار نہیں کی گئی۔ کامران نے یہاں تک

چاہا کہ اس کی عزت اس کی ماں سے زیادہ کرے۔ لیکن اس نے اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا

۱۵۴۵ء میں جبکہ ہمایوں نے دوبارہ کابل فتح کیا تو گلبدن بیگم وہیں تھیں۔

۲۰ نومبر ۱۵۵۱ء کی تاریخ بھی کیسی منحوس تھی۔ اس دن ان کا سب سے پیارا بھائی ہندال جس سے اس کو حد درجہ محبت تھی۔ کامران کے ایما سے لڑائی میں مارا گیا۔ اس کا جنازہ جے شاہی جو گلبدن کے شوہر خضر خواجہ کی جاگیر میں تھا پہنچایا گیا اور پھر وہاں سے کابل لاکر بابر کے پائنتی دفن کیا گیا گلبدن کو اس واقعہ جانکاہ کا بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ وہ زار و قطار روتی اور کہتی تھی کہ اگر میرا لڑکا یا شوہر اس کی بجائے مرجاتا تو مجھ کو کچھ افسوس نہ ہوتا۔ حیف صد حیف! اور یہ شعر بار بار پڑھتی تھی۔

اے دریغا۔ اے دریغا۔ اے دریغ
آفتابم شد نہاں در زیر میغ

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی رقیہ کی شادی ہمایوں کے لڑکے جلال الدین محمد اکبر سے کردی۔ اکبر اعظم کی یہ پہلی بیوی تھی۔ اس کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۸۰ سال کی عمر پائی اور اکبر کی وفات کے بعد تک زندہ رہی۔

کابل میں امن و امان قائم کرنے کے بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے شمالی ہندوستان دوبارہ مسخر کیا۔ لیکن بہت جلد یہ خوشی غم سے مبدل ہوگئی۔ ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو زینے سے گر کے اس کا انتقال دہلی میں ہوگیا۔

ہمایوں کے بعد اس کا نامور بیٹا اکبر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اور جب ملک میں پورے طور پر امن و سکون قائم ہوگیا تو اس نے خاندان شاہی کو کابل سے بلا لیا۔ چنانچہ سب کے ساتھ گلبدن بھی ہندوستان آئی۔ اکبر نے اس کے شوہر خضر خواجہ کو لاہور کا گورنر مقرر کردیا اور سکندر شاہ سوری کے قلع قمع کرنے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ گو وہ کوئی عمدہ سپاہی نہ تھا لیکن چونکہ وہ اکبر کا پھوپھا تھا اور اس سے پہلے اعلیٰ خدمات انجام دے چکا تھا اس لئے یہ عہدہ اس کو تفویض کیا گیا۔

اس کے بعد گلبدن کی تمام زندگی نہایت عیش و آرام اور بے فکری کے ساتھ بسر ہونے لگی اور بجز ان فرائض کے جو بحیثیت ایک بیوی اور ماں کے اس پر عائد تھے۔ اس کی توجہ اور کسی کام کی طرف نہ رہی۔ خانہ داری کے کاموں سے اس کا جو وقت بچتا تھا اس کو وہ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتی تھی۔ ان مشاغل کے لئے اس کے پاس کافی سامان تھا۔ کیونکہ دورہ میں شاہی خیمے کے برابر اس کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا اور تمام امورات شاہی سے وہ پورے طور پر باخبر رہتی تھی۔

اکبر گلبدن کی بڑی عزت کرتا تھا اور امور سلطنت میں ہمیشہ اُس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ۱۵۷۵ء میں جب اُس نے حج کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر کو اس کی جدائی کا خیال بہت شاق گزرا اور اُس نے اُسے جانے سے باز رکھنے کے لئے بہت سی تدابیر کیں لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔

۱۵ اکتوبر ۱۵۷۵ء کو وہ مع ایک جم غفیر کے جس میں مرزا اور عورتیں شامل تھیں۔ فتح پور سیکری سے روانہ ہوئی۔ شہزادہ مراد شاہی حکم سے ان سب کو سورت تک پہنچانے کے لئے تعینات کیا گیا۔

سورت تک یہ تمام قافلہ بخیر و خوبی پہنچ کر جہاز پر سوار ہوا۔ لیکن پرتگالیوں نے جہاز کو گرفتار کر لیا۔ اور بہزار دقت یہ قافلہ زیر نگرانی باقی خاں اور رومی خاں جو بابر کے ترکی تھے روانہ ہوا اور پورے ایک سال کے بعد خلیج فارس میں پہنچا۔ وہاں سے ان لوگوں نے مکہ معظمہ کی راہ لی ساڑھے تین سال تک یہ لوگ مکہ معظمہ میں رہے اور ۴ مرتبہ حج کیا چوتھے سال یہ سب لوگ واپس ہوئے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے عدن پہنچے۔ عدن سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز ایک چٹان سے جا لگا۔ لیکن خدا کے فضل سے ایک اور جہاز آ نکلا جس پر بایزید بیات کے بال بچے ہندوستان آ رہے تھے۔ یہ بھی سب اس پر سوار ہوئے اور ہندوستان پہنچ گئے۔

افسوس ہے کہ اس نے اپنے سفر کے حالات قلم بند نہیں کئے ورنہ اس زمانے کے حالات کا بہترین مرقع ہوتے۔ اور سفر میں جو مصائب و مشکلات واقع ہوتی تھیں اُن کا اس سے پتہ چلتا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد شہنشاہ اکبر کے حکم سے اس نے ہمایوں نامہ لکھا جو اصلی باعث اس کی شہرت کا ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ بڑے بڑے مصنفین اور مورخین اس امر کو نہیں جانتے کہ گلبدن بیگم نے کوئی ہمایوں نامہ بھی لکھا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ لیکن اکبر نامہ میں جس میں اس سے بہت مدد لی گئی ہے اس کا ذکر ہے۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں گلبدن بیگم کا حال لکھا ہے۔ بعد کوشش بسیار ہمایوں نامہ کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم کو دستیاب ہو سکا ہے جس کو ہملٹن نے دہلی سے حاصل کیا تھا۔ اس کے آخر کے کئی ورق غائب ہیں اور شروع اور آخر میں چند سادے ورق لگے ہوئے ہیں۔ باوجود بڑے بڑے انعامات کے اعلان کے کوئی دوسرا نسخہ اس وقت تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے صرف چند نسخے ہی لکھے گئے تھے جو حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکے

ہمایوں نامہ زباندانی کے لحاظ سے کوئی بڑے پایہ کی کتاب نہیں ہے گو وہ فارسی میں لکھی گی ہے۔ لیکن جگہ بہ جگہ ترکی الفاظ استعمال کئے

گئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ گلبدن بیگم کی مادری زبان ترکی تھی اور اس زمانے کی فارسی میں اس زبان کے الفاظ مستعمل تھے۔

تاریخی لحاظ سے البتہ وہ بہت بیش قیمت ہے۔ علاوہ قدیم اور خاص اُس زمانے کے ہونے کے جس کا کہ اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ گلبدن بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی جس سے زیادہ سلطنت کے اندرونی حالات سے کوئی اور دوسرا شخص واقف نہیں ہو سکتا۔

گلبدن بیگم شاعری میں بھی کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور گو بچپن ہی سے اس کی طبیعت میں ذہانت، جدت اور شوخی تھی لیکن زیادہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ بڑھاپے کی حالت میں جبکہ رنج والم نے اس کا بالکل کام ہی تمام کر دیا تھا۔ اُس کی قوت متخیلہ اتنی ہی بلند پرواز تھی اور شعر و شاعری کا مذاق بدستور اس کی طبیعت پر حاوی تھا۔ افسوس ہے کہ اس کا دیوان اور اس کے اشعار دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ پس ان کے متعلق کوئی رائے نہیں دی جا سکتی کہ اُس کے اشعار کس پائے کے ہیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام اُس نے زہد و تقوےٰ میں گذارے اپنی جیب خاص سے لوگوں کو روپیہ دے کر حج کرنے کو بھیجتی تھی۔

۷ فروری سنہ ۱۶۰۳ء میں بخار میں مبتلا ہوئی۔ حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اسی مہینہ کی ۷ تاریخ کو بعد توبہ و استغفار ۸۰ برس کی

عمر میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی راہ لی۔

تمام خاندان شاہی میں اس غمناک واقعہ نے ماتم بپا کر دیا۔ حمیدہ بانو والدہ اکبر کو بالخصوص نہایت رنج ہوا۔ اکبر خود اس کے جنازے کے ساتھ گیا اور اس کو کاندھا دیا۔

نورجہاں بیگم

اس بیگم کا اصلی نام مہرالنساء خانم تھا۔ جب شہنشاہ جہانگیر کے عقد میں آئی تو نور محل اس کا لقب ہوا۔ پھر نورجہاں خطاب ہوا اور تواریخ میں اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔

یہ بیگم طہران کے ایک اعلیٰ اور معزز خاندان کی بیٹی تھی۔ اس کا دادا خواجہ محمد شاہ ایران کا وزیر اعظم تھا اور دوسرے رشتے دار بھی اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ خواجہ محمد شاہ کے بعد اس کے بیٹے مرزا غیاث کا ستارہ کچھ ایسا گردش میں آیا کہ نانِ شبینہ تک کو محتاج ہو گیا۔ یا آخر تنگ آکر اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہنے اور تلاشِ معاش کے لئے ہندوستان روانہ ہونے پر مجبور ہوا۔ چنانچہ مع اپنی زوجہ دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے

ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں جبکہ یہ قافلہ قندھار پہنچا نور جہاں پیدا ہوئی۔ مصائب درجۂ انتہا کو پہنچ چکے تھے ان سب پر دو تین دن کا فاقہ تھا۔ ایسی مصیبت اور بے سر و سامانی کی حالت میں لڑکی کی پرورش اور بھی دو بھر معلوم ہوئی۔ چار ناچار بہ جبر و اکراہ کلیجہ پر پتھر رکھ اس رستہ پر جس پر دوسرے دن صبح کو قافلہ گذرنے والا تھا ڈال آئے۔ اس وقت تو اس بچی کی پیدائش ان کو اس قدر منحوس معلوم ہوئی تھی انھیں کیا خبر تھی کہ یہی معصوم اور بے کس بچی ایک دن ہندوستان جنت نشان کی بلند اقبال ملکہ بننے والی ہے۔ اس قدر باکمال ہوگی کہ اپنی فراست اور دانائی کا نقشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات پر چھوڑ جائے گی اور اس کا نام ہمیشہ عزت اور فخر کے ساتھ لیا جایا کرے گا۔

دوسرے دن جب کہ قافلہ اس راہ سے گذرا تو ایک سوداگر کی نظر اس بچی پر پڑی۔ اس کو رحم آیا وہ اُس کی تربیت کا کفیل بنا۔ بعد ازاں نور جہاں کی ماں کو دودھ پلانے پر ملازم رکھ لیا۔

جب سوداگر کو یہ سب حالات معلوم ہوئے تو وہ ان سب کے ساتھ کمال مہربانی و لطف عنایت سے پیش آیا اور نور جہاں کے باپ اور لڑکوں کو اپنے تجارتی کاروبار میں لگایا جس سے ان کا افلاس دور ہو گیا۔

بعدازاں اس سوداگر کے ذریعے سے اُن کی رسائی اکبر کے دربار تک ہوئی۔ اکبر نے اس کے باپ اور بھائی کو معمولی عہدوں پر مقرر کر دیا جہاں انھوں نے اپنی اعلیٰ قابلیت کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ بہت جلد دربار شاہی میں اپنا رسوخ بڑھا لیا۔ اور مناصب جلیلہ پر مامور کر دئے گئے۔ نورجہاں کی ماں بلا روک ٹوک محل شاہی میں آنے جانے لگی۔ نورجہاں بھی اکثر اپنی ماں کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ جب یہ لڑکی جوان ہوئی تو اس کی خوب صورتی، دانائی، حاضر جوابی اور اعلیٰ قابلیت کا چرچا ہونے لگا۔

اکبر نے اس کا عقد ایک فارسی نوجوان شیرافگن کے ساتھ کر دیا شیرافگن کا اصل نام علی قلی تھا۔ اور اس کا باپ ایران میں شاہ اسمٰعیل کے یہاں ایک اعلیٰ عہدہ پر ملازم رہ چکا تھا۔

اکبر نے بردوان کے علاقہ کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو یہ اطلاع پہنچی کہ شیرافگن خود مختار رہنا چاہتا ہے۔

جہانگیر نے قطب الدین کو جو خواجہ سلیم چشتی رحمتہ اللہ کا داماد اور اس کا رضاعی بھائی تھا، بنگالہ کا گورنر بنا کر بھیجا اور شیرافگن کے ارادے کی تفتیش کا کام اس کے سپرد کیا۔ قطب الدین نے وہاں پہنچ کر ان سب

باتوں کی تصدیق کی اور شیر افگن کو اپنے روبرو طلب کیا لیکن شیر افگن نے حاضر ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ قطب الدین بذات خود بردوان روانہ ہوا اور سیدھا شیر افگن کے مکان پر جا دھمکا۔ طرفین میں باہم سخت کلامی ہوئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیر افگن نے غیظ آلود ہو کر خنجر آبدار سے قطب الدین کا کام تمام کیا۔ یہ دیکھتے ہی شاہی سپاہی جو قطب الدین کے ہمراہ تھے شیر افگن پر ٹوٹ پڑے، اور ایسے کاری زخم لگائے کہ وہ بھی جانبر نہ ہو سکا

گورنر کا قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ علاوہ بریں وہ شہنشاہ جہانگیر کا رضاعی بھائی تھا۔ شاہی فوج نے نور جہاں کے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نور جہاں قید کر کے جہانگیر کے روبرو دربار شاہی میں حاضر کی گئی۔ جہانگیر نے اپنی سوتیلی ماں رقیہ بیگم کی خدمت اس کے سپرد کی۔ یہ رقیہ بیگم شہنشاہ بابر کی مشہور دختر گلبدن بیگم کی لڑکی تھی۔ پس نور جہاں شاہی محل میں رہنے لگی۔

جہانگیر کے دل میں نور جہاں کی محبت نے اسی وقت سے گھر کر لیا تھا جبکہ شیر افگن کے ساتھ اس کا عقد نہ ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ مستقل طور سے وہ شاہی محل میں رہنے لگی۔ اس کے حسن و جمال، اس کی حاضر جوابی سلیقہ مندی اور دیگر خصائل حمیدہ کو دیکھ کر جہانگیر نے اس سے

شادی کی درخواست کی۔ نورجہاں پہلے تو برابر ٹالتی رہی، کیونکہ شیر افگن کی موت کا اس کے دل پر نہایت سخت صدمہ تھا۔ لیکن بادشاہ کے زیادہ اصرار کرنے سے مجبور ہو کر اس نے شادی کی درخواست کو منظور کر لیا اور ۶ جلوس جہانگیری مطابق ۱۶۱۱ء میں نہایت دھوم دھام کے ساتھ یہ شادی سرانجام پائی۔

مورخین نے اس شادی پر طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے قصداً شیر افگن کو قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں پر قابض ہو جائے۔ گو اس واقعہ کے ٹھیک ہونے سے نورجہاں کے کیریکٹر پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آسکتا۔ کیونکہ شادی کے لئے اس نے آخر وقت تک اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی البتہ بادشاہ کی ضد سے آخر کو مجبور ہو گئی۔

لیکن اگر ہم اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھیں تو اصلیت صاف عیاں ہو جاتی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ جہانگیر نورجہاں سے پہلے ہی شادی کرنا چاہتا تھا تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کون سی بات اپنے اس مقصد کو پورا کرنے سے روک سکتی تھی۔ رہی یہ توجیہہ کہ اکبر مانع تھا تو یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اکبر کیوں مانع تھا۔ کیونکہ نورجہاں ایک نہایت اعلیٰ اور شریف خاندان کی لڑکی تھی۔

نورجہاں کی والدہ کو بھی جہانگیر کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی انکار

نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جہانگیر ولی عہد سلطنت تھا۔ علاوہ بریں جب شیر افگن قتل کیا گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی شادی نہیں ہوئی۔ اگر اس نے اس ارادے سے اس کو قتل کرایا تھا تو پانچ سال تک عقد نہ ہونے کے کیا معنی غیر تمند شیر افگن کو اگر بادشاہ کے اس ایما کی خبر تھی تو ننگ و ناموس کی حفاظت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پہلے نور جہاں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا اس کے بعد مردانہ وار لڑ کر جان دے دیتا۔

نور جہاں کی شادی جس وقت جہانگیر سے ہوئی اس کی عمر ۳۴ سال کی تھی اور شرق کی عورتیں اس عمر میں تقریباً بوڑھی ہو جاتی ہیں پس ان باتوں کے ہوتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جہانگیر کی نور جہاں سے محبت کی بڑی وجہ اس کا ظاہری حسن نہ تھا بلکہ وہ اعلیٰ خصائل پسندیدہ عادات، سلیقہ مندی، شیریں کلامی، نکتہ سنجی، فراست و دانائی تھی اور انھیں سب باتوں نے مل کر جہانگیر کے دل پر پورا تسلط جما لیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد اس کے ساتھیوں کو اس امر کا شبہہ ہوا اور انھوں نے اس قصے کو شہرت دی پھر جب بادشاہ نے نور جہاں سے شادی کر لی تو ان کے خیالات کو اور تقویت ہوئی اور ان کا شبہ یقین کے درجہ کو پہنچ گیا، اور اس واقعہ کو مؤرخین نے درج کر دیا۔

شادی کے بعد نور جہاں کو وہ درجہ نصیب ہوا کہ سلاطین مغلیہ کی کسی بیگم کو نصیب نہیں ہوا۔ فرمانِ شاہی پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔ سونے اور چاندی کے سکے پر بادشاہ کے نام کے ساتھ اس کا نام کندہ کیا جاتا تھا۔ ایک سکے پر یہ شعر کندہ کیا گیا تھا ؎

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

اس کے باپ کو اعتماد الدولہ کا خطاب مرحمت فرمایا گیا، اور وزارت عظمیٰ کا جلیل القدر منصب اس کے سپرد کیا گیا۔ اس کے دونوں بھائی آصف خاں اور اعتقاد خاں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے گئے غرض اس کے اقتدار کی کوئی حد نہ تھی، جو کچھ وہ چاہتی تھی کرتی تھی اس کی مرضی ہی قانون تھی۔ بادشاہ کی طبیعت پر اُسے پورا قابو حاصل تھا۔ بغیر اس کے مشورہ و صلاح کے وہ کچھ نہ کرتا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ امورِ سلطنت کے انجام دینے کے لئے نور جہاں کافی ہے۔ بجز ایک جام شراب کے مجھکو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نے بادشاہ کے مزاج میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا اس کی سنگدلی اور بے رحمی میں بہت کمی ہو گئی۔ شراب خوری بھی کم کر دی۔

اس کی سخاوت مشہور تھی۔ غریب اور لاوارث لڑکیوں کی شادی کے اخراجات خود اٹھاتی تھی۔ خانگی امور میں وہ ایک نہایت باسلیقہ عورت تھی۔ اس کی طبیعت میں خاص جدت تھی۔ زیور لباس اور کھانوں میں اُس نے طرح طرح کی ایجادیں کیں۔ گلاب کا عطر اسی کی ایجاد ہے۔

اس کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کو شعر و سخن سے مناسبت تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہتی۔ گھوڑے کی سواری فنون سپہ گری میں بھی اس کو کافی مہارت تھی۔

ایک بار بادشاہ شکار کھیلنے کے لئے گیا۔ نور جہاں بھی اس کے ہمراہ تھی۔ قراولوں نے پہلے سے چار شیر گھیر رکھے تھے۔ نور جہاں نے شیروں پر گولی چلانے کی اجازت بادشاہ سے طلب کی۔ بادشاہ نے بخوشی منظور کیا۔ حکم شاہی پاتے ہی دو شیروں کا دو گولیوں سے کام تمام کر دیا اور دو شیروں کو تیروں سے گرا دیا۔ یہ پھرتی جواں مردی اور نشانہ بازی دیکھ کر بادشاہ اور اس کے سب ہمراہی دنگ رہ گئے۔ بادشاہ نے فوراً ایک ہزار اشرفیاں نثار کئے جانے کا حکم دیا اور ایک انگشتری سچے الماس کی جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی اس صلہ میں بیگم کو مرحمت فرمائی۔

اُس نے اپنی چھوٹی لڑکی کا (جو شیر افگن سے تھی) عقد جہانگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہریار سے کر دیا۔ اس وقت تک وہ شہزادہ خرم کے ساتھ نہایت محبت اور مہربانی سے پیش آتی رہی۔ لیکن اس شادی کے بعد اس نے کوشش کی کہ شہزادہ خرم کو ولی عہدی سے معزول کر کے شہریار کو ولی عہد بنا دے تاکہ جہانگیر کے بعد بھی اس کی قوت و اقتدار میں فرق نہ آوے اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے خرم کو قندھار کی مہم پر روانہ کیا اس کی فوج میں تخفیف کئے جانے کا حکم بھیجا۔ اس کی جائداد ضبط کر کے شہریار کو عطا کر دی اور اُسے حکم بھیجا کہ اسی قیمت کی ایک دوسری جائداد اپنے لئے خرید لو۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہجہاں نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

شہزادہ خرم کی قوت کو کمزور کرنے اور بغاوت فرو کرنے کا کام اس نے مہابت خاں کے سپرد کیا۔ یہ شخص کابل کا گورنر تھا اور اکبر کے زمانے میں اعلیٰ عہدوں پر رہ چکا تھا۔

جب مہابت خاں بغاوت کو فرو کر چکا۔ اور خرم نے بالآخر باپ کے آگے سر اطاعت خم کیا تو نورجہاں کو اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف پیدا ہوا پس اس نے اس کے اقتدار کو کم کرنے کا تہیہ کر لیا چنانچہ مہابت خاں نے اول تو حیلہ کیا لیکن بالآخر مجبور ہو کر پانچ ہزار راجپوتوں کی جمعیت کے

ساتھ حضورِ شاہی میں آیا۔ جہانگیر اس وقت کابل کی جانب جا رہا تھا اور اس کا خیمہ دریائے جہلم کے کنارے نصب تھا۔ شاہی فوج دریا کو عبور کر چکی تھی۔ بادشاہ مع چند ساتھیوں کے باقی رہ گیا تھا۔

مہابت خاں کو پورا یقین تھا کہ میں ذلیل و خوار کیا جاؤں گا۔ پس اس نے موقع کو غنیمت جان کر راجپوتوں کی فوج سے بادشاہ پر حملہ کیا اور اس کو اپنی حراست میں لے لیا۔

نورجہاں کو اس واقعہ کا نہایت صدمہ ہوا لیکن ایسے آڑے وقت میں بھی اس نے اپنی دور بینی اور دانائی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ مہابت خاں کے پنجے سے نکل کر ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر دریا کی دوسری جانب جا پہنچی۔ وہاں پہنچ کر اس نے شاہی فوج کو بہت سخت و سست کہا اور افسروں کو بلا کر لعنت ملامت کی کہ تم نے جیتے جی بادشاہ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

تمام فوج کو تیار کیا خود تیر و کمان لے کر ہودہ میں بیٹھی اور سب سے پہلے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا ایک طرف سے جہاں دریا پایاب تھا فوج نے دریا کو عبور کیا۔ پانی کی رو تیز تھی جا بجا گڑھے تھے۔ فوج کے بہت سے آدمی ڈوب کر مر گئے۔ بارود سب بھیگ گئی۔ باقی ماندہ فوج بہادر راجپوتوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئی۔

خود نورجہاں کا ہاتھی زخمی ہوا۔ فیل بان قتل ہوا۔ شہریار کے بچے جو اس کے ساتھ ہودہ میں تھے زخمی ہوئے۔ مجبوراً نورجہاں نے بھی اپنے تئیں مہابت خاں کے حوالے کیا اور جہانگیر کے ساتھ قید میں چلی گئی وہاں پہنچ کر پہلے اس نے اپنے برتاؤ سے مہابت خاں پر اس امر کے اظہار کی کوشش کی وہ اور بادشاہ دونوں اس قید میں بہت خوش ہیں اور وہ کسی قسم کی خفیہ سازش کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس کے طرزِ عمل نے مہابت خاں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور [illegible] ان کی حفاظت سے غافل ہوگیا۔ بعد ازاں اس نے خفیہ طور پر چند ملازم رکھے جو افغانیوں کو بادشاہ کی حمایت میں اٹھنے کے لئے ابھارتے تھے۔

مہابت خاں کا راجپوتوں کے ساتھ عمدہ سلوک افغانیوں کو بہت ناگوار تھا۔ اس لئے وہ سب نورجہاں کے شریک ہوگئے۔ اور موقعے منتظر رہے۔ ایک دن اس نے اپنی ذاتی فوج کا معائنہ کیا۔ قواعد کے اثناء میں شاہی فوج بادشاہ اور نورجہاں کے چاروں طرف آگئی پھر یہ سب فوج راجپوتوں پر ٹوٹ پڑی اور انھیں شکست دے دی۔

مہابت خاں نے بھاگ کر قریب کے کسی شہر میں پناہ لی اور اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ اس کی درخواست اس شرط پر منظور ہوئی کہ وہ شہزادہ خرم کا مقابلہ کرے اور شکست دے۔

جس طریقے سے اس نے بادشاہ کو قید سے رہائی دلائی۔ اس سے اس کی کمال عقل مندی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ عرصے تک بادشاہ زندہ نہیں رہا۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۶۲۶ء کو بمقام لاہور بعارضہ ضیق النفس اس دار فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی اور نورجہاں کے باغ میں دفن کیا گیا۔ اس کے انتقال کے ساتھ ہی نورجہاں کی قوت و اقتدار اور عیش و راحت کا خاتمہ ہو گیا۔

بادشاہ کے انتقال کے بعد شہریار کی جانشینی کا اعلان کیا گیا لیکن خرم کے آتے ہی سب نے اس کو چھوڑ دیا۔ شہزادہ خرم شاہجہاں کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس نے نورجہاں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اس کا کمال ادب ملحوظ رکھتا تھا۔ ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن نورجہاں کا دل ٹوٹ چکا تھا اور دنیاوی عیش و عشرت سے اس کی طبیعت ہٹ گئی تھی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد گیارہ برس سفید کپڑے پہن کر سوگ میں گزارے۔ ۱۶۴۶ء میں بہتر برس کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا اور اپنے شوہر کے قریب مدفون ہوئی۔

اس کے مقبرہ کی خراب خستہ حالت یاس و حسرت اور بے کسی کی ایک زندہ تصویر ہے اس پر نہایت دردناک اشعار تحریر ہیں منجملہ ان کے ایک شعر یہ ہے ؎

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزدے نے صدائے بلبلے

یہ سب اشعار دنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرتے اور ان لوگوں کے لئے جو دنیاوی عیش و عشرت میں غرق ہیں نہایت سبق آموز ہیں۔

ملکہ جودہ بائی

ہماری اکثر ناظرین بہنیں خصوصاً تاریخی مذاق رکھنے والی بیویاں مہارانی جودہ بائی کے نام نامی سے ضرور واقف ہوں گی۔ تاہم عجب نہیں ہے کہ اُن کی اخلاقی خوبیاں اور سوشیل قابلیتیں جو زمانہ سوانح عمری کی گویا جان ہیں۔ بہت کم بیویوں کو معلوم ہوں، کیونکہ جس طرح اور صدہا قابل و ممتاز عورتوں کے لائق تذکرہ واقعات حالات ہماری مورخ صاحبوں کی توجہ کے شرمندۂ احسان نہیں ہیں۔ اسی طرح اس نامور ملکہ ہندوستان کے مفصل حالاتِ زندگی بھی عام تاریخی نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن باوجود تاریخ کی اس افسوسناک پہلوتہی کے، اور باوجود اس کے کہ رانی ممدوحہ کے زمانے کو کئی صدیاں گزر گئیں کیا سبب ہے؟ کہ رانی جودہ بائی

کا نام آتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہے۔ بلاشبہ جودہ بائی ایسے گھر کی بیٹی اور ایسے گھر کی بہو تھیں جو اپنے زمانے میں اس کے مصداق تھے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ان کی یادداشت کے لیے چندر بنسی خاندان کی راج کنواری اور خاندانِ تیموریہ کے ایک شاہنشاہ کی پاٹ رانی ہونا کافی ہے مگر اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس باعصمت شوہر پرست خوش سیرت، دانشمند اور عظیم الشان رانی نے اپنی کیرکٹر میں ہمارے لیے ایسی سبق آموز اخلاقی اور تمدنی مثالیں قائم کی ہیں جو کسی طرح بھولنے کے قابل نہیں ہیں اور اگرچہ وہ امتداد زمانہ کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں مگر باریک بین نگاہیں ان کے نتیجہ خیز ہونے سے انکار نہیں کر سکتی

رانی جودہ بائی اگرچہ ایک ہندو شاہی خاندان کی راج کنواری تھیں مگر جب ایک مسلمان شاہنشاہی خاندان میں بہو بن کر آئیں تو انھوں نے اپنے اس اہم فرض منصبی کو اس خوبی سے نبھایا جس طرح ایک فرزانہ زنیک باطن ملکہ نبھا سکتی ہے۔

رانی جودہ بائی کی بیہ گرانی صرف ان کی صفات حسنہ اور خلاق

جمید مری کی وجہ سے قیمتی اور وزن دار نہیں ہے۔ بلکہ ہندو مسلمانوں کے باہمی پولٹیکل اور سوشیل تعلقات کے لحاظ سے بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اپنی ہم رتبہ رانیوں کی طرح اس دانش مند رانی کا وجود مسعود بھی ان دو متضاد قوموں کے بیچ میں ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جو دو زنجیروں کو آپس میں ملا کر ان کی قوت کو دوگنا کر دیتا ہے۔ یا حرف مشدد تھا جس نے اپنے دونوں پہلوؤں کو فیض پہنچا کر ان کی قوت کو مکمل کر دیا تھا افسوس کہ جو مفید و خوش گوار ارتباط و اختیار کئی سو برس تک ہندو مسلمان دونوں قوموں کو بے انتہا فائدہ پہنچاتا رہا وہ اب ناسمجھی اور خود غرضی کے ہاتھوں کیسا رائیگاں ہو رہا ہے۔

خاندان و پیدائش و تعلیم و تربیت

رانی جودھ بائی۔ راجہ مالدیو کی پوتی۔ رانی جودھ بائی راٹھور خاندان سے تھیں جو راجپوتوں کے اعلیٰ خاندانوں میں سے ایک خاندان ہے۔ رانی صاحبہ کی تاریخ و سن ولادت بتلانے سے میں تو کیا جتنی تاریخیں میری نظر سے گزری ہیں سب عاجز ہیں۔ اسی طرح تعلیم و تربیت کا بھی صحیح صحیح حال معلوم نہیں۔ ہاں محل کے بعض اندرونی واقعات جو بزرگوں کی زبانی سننے میں آتے ہیں ایسے ہیں کہ جن سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ رانی ہرگز کودن اور بے لکھی نہ تھی بلکہ اعلیٰ درجہ کی شائستہ، حاضر جواب اور تیز طبیعت کی تھی

تیزی کے ساتھ مزاج میں چونچلا پن اور شوخی بھی بے حد تھی۔ جو اپنی حریف غالب نور جہاں بیگم جیسی نرزانہ مشہور روزگار سوکن کو آئین شائستہ نیچا دکھانے کو ہر وقت تیار رہتی تھی۔

معیار تعلیم کے بارے میں گو تردد ہو، مگر اس میں شبہ نہیں کہ تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر پائی ہوگی۔ اس لئے کہ اس زمانے کی زندگی میں جس میں قابلیت دکھانے کا زیادہ موقع ہوتا ہے بہت سے تمدنی معاملات و مراسم کی تراش خراش، اوقات کی پابندی اپنے درجے کی عظمت و وقار کا قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ جس کا ذکر آئندہ برمحل آئے گا۔ بغیر اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتگی کے ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تربیت یافتگی یوں بھی قرین قیاس ہے کہ جب اس زمانے میں ادنیٰ غریب لوگ جو محض جاہل ہوتے تھے علماء و فضلاء کی صحبت میں بیٹھ کر اس زمانے کے معمولی پڑھے لکھوں سے بہتر ہو جاتے تھے۔ چار دیواری کی بیٹھنے والی معمولی بیبیاں اپنی طبیعت داری سے اعلیٰ طبقے کی بیگمات کی صحبت پا کر ہوشیار ہو جاتی تھیں تو ایک والی ملک مہاراجہ کی پیاری بیٹی کو اعلیٰ تربیت میسر آنی بالکل لگتی لگاتی بات ہے۔

شادی: یہ رانی شہنشاہ اکبر کی بہو۔ اور شہزادہ سلیم الملقب نور الدین جہانگیر کی بیاہتا بیوی ہیں۔ خاندانِ تیموریہ میں کئی رانیوں کو بہو

سننے کا فخر حاصل ہوا مگر جس آن بان تمہت اور چار چاند تجلیوں سے یہ رانی آئیں وہ کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا ۔ رانی جودہ بائی سہرے جلوے کی لہن اور بچوں کی دی ہوئی ایسی ہی بہو تھیں جن کو گھر کی نیو کہتے ہیں۔

ہندوستان کی رسم کے مطابق ان کی خواستگاری اُن کے باپ سے خود شاہنشاہ اکبر نے بڑی تمنا کے ساتھ اس وقت کی جبکہ نورالدین جہانگیر عالم شہزادگی میں تھے ۔ اور راجہ سے وعدہ کیا کہ میں خود بیاہنے آؤں گا ۔ اور جس طرح ساس سسرے اپنے برابر کی بیٹیوں کو بیاہ کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح وداع کر کے اپنے گھر لاؤں گا۔ راجہ نے اپنے شہنشاہ وقت کی اس قدر افتادہ و ہمسرانہ درخواست کو دل و جان سے منظور کر کے بڑی دھوم سے شادی کا سامان کیا۔ جہاں پناہ مع شہزادے اور چیدہ سرداروں کے جودھپور تشریف لے گئے۔

اس وقت اکبری کیمپ کا جاہ و جلال جس میں شادی کی گھما گھمی اور چہل پہل سونے پر سہاگہ تھی ۔ قابل دید ہو گا ۔ مارواڑ کا ریگستان گلزار بنا ہوا ہو گا ۔ راجہ کی طرف سے قرب و جوار کے رجواڑوں ۔ بھائی بھتیجوں اور تمام برادری والوں کو بلاوے بھیجے گئے ۔ اور جیسا کہ اہل ہنود کا دستور ہے کہ برات کو کئی کئی دن تک دعوت دیتے ہیں اسی طرح بادشاہ کی بھی خدم و حشم اور بھیر بھینگے سمیت کئی دن تک بڑے تکلف کے ساتھ

ضیافت کی گئی

راجہ کے محل میں عظیم الشان منڈھا چھوایا گیا جس کا سونے کا کلس دور دور سے نظر آتا تھا۔ منڈھے کے نیچے اس شاہی جوڑے یعنی دولہا دلھن کے تمام مراسم شادی ادا کئے گئے۔ یہ وہی منڈھا تھا جس کا تعریفی گیت (جو منڈھے ہی کے نام سے مشہور ہے) آج تک دلّی کی ڈومنیاں اور اربابِ نشاط دلہن کے گھر میں ہنگام وداع وقت کی راگنیوں میں بڑے درد سے گا گا کر جہانگیر و جودھ بائی کی شادی کا سماں باندھا کرتے ہیں۔ خصوصاً خاندانِ تیموریہ کے بچے کھچے اجڑے ہوئے گھروں میں اب بھی جس وقت دلہن وداع ہونے لگتی ہے تو وہی منڈھا گایا جاتا ہے۔ خدا جانے کس بلا کی تاثیر اس منڈھے کے بولوں میں ہے کہ دلہن والے تو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہی ہیں۔ دولھا والے بلکہ بعض رقیق القلب دولھا بھی اس پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں چونکہ یہ منڈھا دراصل ایک بہت بڑی شادی کی یادگار ہے اس لئے اس کے کچھ بول یہاں لکھنے بے موقع نہ ہوں گے۔

منڈھا

۱۔ پربت بانس کٹا مورے بابل

نی کا منڈھا چھوا دو رے

۲۔ منڈھے اوپر کلس براجے
دیکھیں راجہ راؤ رے
پربت الخ

۳۔ تہاری رے بیٹی تہارے محلوں کی چیری
ہم باندغلام رے
پربت الخ

۴۔ تہاری رے بیٹی مہارے محلوں کی رانی
تم صاحب سردار رے
پربت الخ

اس میں کچھ انترے اور بھی ہیں جو زائد سمجھ کر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ بزرگوں در بزرگوں کی زبانی روایت ہے کہ اس شادی میں ہندی اسلامی دونوں قطع کے مراسم ادا کیے گئے تھے۔ جب رخصت کا وقت ہوا، اور دلہن کو نالکی میں سوار کرایا گیا تو دلہن کے باپ مہاراجہ جودھپور نے اپنی لڑکی کے خسر شاہنشاہ اکبر کے آگے ہاتھ باندھ کر نہایت عجز و انکسار کے الفاظ عرض کیے، اور بادشاہ کے بہ نفس نفیس تشریف لانے اور اعزاز کے ساتھ بیاہ لے جانے سے ہم چشموں میں جو عزت افزائی ہوئی تھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ اکبر نے بھی اس عقیدت و وفاداری

کا نہایت تلطف آمیز اور قدر افزا جواب دیا۔ یہ دونوں سوال و جواب سندھ کے انتر ے نمبر ۳، ۴ میں بڑی خوبی سے بیان ہوئے ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رانی جودھ بائی دلہن بنی ہوئی "نالکی"[1] میں سوار ہیں شہزادہ سلیم دولہا بنا ہوا ہے۔ اکبر بادشاہ اور مہاراجہ جودھپور دونوں نالکی کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک طرف اپنی پالیسی کی کامیابی کا سرور۔ بہو بیاہ کرکے چلنے کی خوشی اور شاہانہ الطاف و کرم کا جوش ہے۔ دوسری طرف شاہنشاہی ہمراز سربلندی کے ساتھ بیٹی بیاہ دینے کا مسرت آمیز رنج اور ادب آمیز عقیدت کا اظہار ہے۔ غرض طرفین کے شاہی جذبات شادمانی و یگانگت کے ساتھ گلے مل رہے ہیں۔ شاہنشاہ اکبر نے

---

[1] نالکی تعزیہ کی قطع کی سواری ہے جو تزک شاہی میں شامل تھی۔ اس کا کلس سونے کا اور رنگ سنہری رنگ روغن کا ہوتا تھا۔ اس کے نیچے چار ڈنڈے ہوتے تھے ہر ڈنڈے میں چار کہار لگتے تھے۔ آٹھ کہار آگے کی طرف ہوتے تھے، آٹھ پیچھے کی جانب۔ یہ سواری بادشاہ بیگم کے لئے مخصوص تھی، یا بادشاہ جس بیوی کو، جس سردار کو عطا فرماتے تھے وہ بیٹھ سکتا تھا۔ شاہی خاندان کی بیٹیاں دلہن بن کر برات اور چوتھی کے دن ہی بیٹھ کر جاتی تھیں۔ بادشاہ کے ہاں سے اُن کے لئے نالکی آجاتی تھی۔

راجہ کو صرف زبان ہی سے یہ جواب نہیں دیا بلکہ شہزادہ سلیم کو اشارہ کیا کہ نالکی کا ایک ڈنڈا اُٹھائے اور دوسری طرف کا ڈنڈا خود کندھے پر رکھ کر نالکی کو اُٹھا لیا۔

بادشاہ کی طرف اس حرکت کے ساتھ ہی تمام امرا و ارکین سلطنت نالکی کی طرف جُھک پڑے۔ ہر سردار یہی چاہتا تھا کہ بادشاہ اور شہزادے سے ڈنڈا بدلوانے میں سابقت میری طرف سے ہو۔ بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ اور سرداران گرامی قدر باری باری سے اپنی اس جان نثارانہ ڈیوٹی کو جس میں کمال درجہ کی شاہانہ عزت اور سچے آرزو ارمان کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، بجالائے۔ کہاروں کے اُٹھانے کی تو نوبت بھی نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ یہ معزز کہار ہی اتنے سارے تھے (جن میں غالباً خود دولہن کے والد صاحب بھی شریک تھے۔) کہ دو دو ہی قدم اُٹھانے پر دلہن کی نالکی خیمہ شاہی تک پہنچ گئی ہوگی۔ درحقیقت یہ ایسی شاہانہ نوازش و خسروانہ قدر افزائی تھی جو سوائے راجہ جودھپور کے اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اور اللہ رے رانی جودہ بائی کی قسمت کا زور! کہ جس جبار بادشاہ کی تلوار کے آگے چاند اور سورج تک سر جھکاتے تھے (چندر بنسی اور سورج بنسی خاندانوں سے مراد ہے) روز ازل میں گویا یہ حصہ ہو چکا تھا کہ یہ اقبال مند لڑکی اس کے اور

اس کے جگر گوشہ کے کندھوں پر سوار ہوگی۔

راجہ نے اپنے اور رانی کے سسرال والوں دونوں کی شان کے موافق بیٹی کو خوب دل کھول کر جہیز دیا۔ نقد و جنس، ساز و سامان، ہاتھی گھوڑے دیہات و جاگیر کے علاوہ (جو قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور ہی ہوگی) تمام وہ کارخانۂ امارت جو شاہی لوازمات میں داخل تھے اور جو راجہ کی سرکار میں رانی جودہ بائی کے لئے علیحدہ مقرر تھے جہیز میں لڑکی کے ساتھ دے دئے۔

ان لوازمات میں رانی کی چیرلیوں (جن کی تعداد سینکڑوں تھی) گائنوں اور نائنوں وغیرہ وغیرہ مختلف اہل خدمت کے علاوہ پنہتیاں اور دل بہلانے والی سہیلیاں اور مصاحبین بھی تھیں سہیلیاں اور مصاحبین سردارزادیاں اور ٹھاکر زادیاں تھیں۔ ان سب کی بھیڑ بھاڑ بجائے خود ایک چھوٹا سا لشکر تھا۔ کیونکہ جو شریف لڑکیاں رانی کی رفاقت میں دارالخلافہ آئی تھیں۔ اُن کے کنبے کے کنبے اُن کے ساتھ ترک وطن کر کے یہاں آ گئے تھے۔ جن کی نسل پُشت در پُشت پھیل گئی۔ گو بعد میں یہ تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہونے کے بعد ان میں خلط مبحث واقع ہو گیا۔ مگر اب تک ان لوگوں کی اولاد جو رانی کے رفقار میں سے تھے اپنے تئیں دیگر اہل خدمات کی اولاد سے

افضل و ممیز سمجھتے تھے اور اپنی قوم کو راجپوت کہتے تھے۔ خاندان تیموریہ کے بالکلیہ مٹنے کے زمانے تک ان لوگوں کی تعداد دلّی میں صدہا کے شمار میں موجود تھی اور اُن کے تمام تعلقات قلعہ اور اہل قلعہ سے وابستہ تھے۔

راجہ نے جو لوگ رانی جودھ بائی کے جہیز میں دیئے تھے اُن کو بادشاہ کی سرکار سے دیہات اور زمینیں عطا ہوئیں۔ چنانچہ ان لوگوں کے جو رشتہ دار دیہات میں ہیں اب تک اُن سے متمتع ہیں اور اس زمانے میں جو لوگ سنہ ۵۷ء کے بعد مر کھپ کر باقی رہ گئے تھے ہمارے سامنے بھی اُن کی رشتہ داری کے تعلقات اُن دیہاتی لوگوں سے باقی تھے۔ شاہنشاہ اکبر جیسے حوصلہ مند بادشاہ نے اپنی پیاری بہو کے تمام کارخانہ جات کو صرف بحالہ قائم نہیں رکھا، بلکہ اُن میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ راویۃً سنا ہے کہ اگرچہ رانی جودھ بائی نے تبدیل مذہب کر کے اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیا تھا مگر اکبر جیسے بے تعصب سسرے نے اُن کے واسطے علیحدہ ایک عالیشان مکان بنوا دیا تھا جس کے جھروکوں میں سے رانی سورج کے درشن کر سکتی تھیں، اور یہ بھی سنا ہے کہ سوا پہر دن چڑھے تک رانی اس جھروکہ میں بیٹھ کر روزانہ بہت کچھ دان پُن کیا کرتی تھیں۔ یہ تمام خرچ شاہی خزانے سے اُن کے لیے مقرر تھے۔

رانی جودھ بائی کی شادی کے واقعات اس شرح و بسط کے ساتھ کسی تاریخ میں آپ کی نظر سے نہیں گزریں گے۔ لیکن یہاں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ گھریلو اور خانگی واقعات و بیانات کی بنا پر لکھا ہے۔ کیونکہ اندرون محل کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کا کسی تاریخ میں تذکرہ نہیں ہے۔ اور ہمارے ہاں وہ روایتیں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ اوّل تو اپنے گھر کی بات۔ دوسرے بہت سے قرائن ایسے ہیں جن سے ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اسی شادی کی یادگار کے دو گیت ایسے ہیں جو میں نے خود خاص اُن لوگوں کی نسل کی عورتوں سے گاتے ہوئے سنے ہیں جن کو میں اوپر بیان کر آئی ہوں کہ رانی صاحبہ کے ساتھ آئے تھے۔ ایک گیت تو یہ ہے ؎

سکھی ری مورا بنرا تو آیا سلطان (الخ)

اور دوسرا یہ ہے ؎

میں تو تہارے ڈیرے آئی رے جلاّ (الخ)

(جلا اکبر سے مراد ہے)

دوسرا گیت تمام راجپوتانہ میں آج تک گایا جاتا ہے اور وہاں اب تک اکبر کو جلاّ جی کہتے ہیں۔ گیتوں کی دلیل مشکوک نہیں ہو سکتی

کیونکہ یہ ہند کا طریقہ ہے۔ چنانچہ جب تسخیر دکن کے ارادے سے حضرت عالمگیر اپنی تمام چیدہ فوج کو دکن لے گئے۔ اور وہاں کے قیام نے اس قدر طول کھینچا کہ بارہ برس گزر گئے تو فوجی سرداروں اور سپاہیوں کے قبائل اور بیوی بچے اپنے اپنے مردوں کے دیکھنے کو سخت بے چین ہوئے اور انھوں نے ان پر آنے کے تقاضے شروع کئے تو انھوں نے اپنی مجبوری کے خطوط لکھے۔ ان نامہ و پیام کے مضامین کو ذیل کے چند ہندی اشعار میں جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے وہ اس زمانے کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے۔

دلی شہر سہاؤنا اور کنچن برسے نیر	سب کے کنتھ بٹور کرے گئے عالم گیر
صاحب کی ملتی کرو اور من میں راکھو دھیر	ابکے بچھڑے جب ملیں جب پلٹیں عالم گیر

دلی میں برسات کے موسم میں ایک ملار گایا جاتا ہے اس میں بھی دلی والی بیویوں کے اسی زمانے کے انتظار کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہے۔
چھپر پرانے ہو گئے۔ کڑکن لاگے ہیں بانس۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے۔ آون آون کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ ماس۔ اے ہو (الخ)
غرض گیتوں سے کچھ کھوج نکالنا غلط نہیں ہے۔

ہندو مسلمانوں پر اس شادی کا اثر

کیا زمانہ کا انقلاب ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض راجپوت اب جودھ بائی کی شادی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے

باعث ہتک خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بیٹی نہیں بلکہ ہمارے ہاں کی لونڈی تھی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھلا اکبر ایسا مورکھ نادان تھا جس کے ہاں بغیر خواہش بڑی بڑی رانیوں کے ڈولے آئے وہ جل میں آکر ایک لونڈی کو کندھے پر بٹھا کر بیاہ لاتا! خیر کوئی کسی نظر سے دیکھے ہمارے نزدیک تو یہ شادی قران السعدین سے کم نہیں تھی۔

بلاشبہ اس سے پہلے بھی ہندوؤں کے ہاں مسلمانوں کے اس قسم کے تمدنی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شاہنشاہِ اکبر نے خود راجہ بہارا مل مہاراجہ جے پور کی بیٹی سے شادی کی۔ جودہ بائی کے علاوہ کچھواہہ خاندان کی ایک دوسری رانی خود جہانگیر کے حبالۂ نکاح میں آئی۔ مگر یہ رشتہ شادی کی دھوم دھام کے سبب سے کچھ اور حیثیت رکھتا تھا۔

ان تمام ازدواجوں نے ہندو مسلمانوں کے ملکی و تمدنی تعلقات کے جو گہرا اور دیرپا اثر ڈالا وہ دونوں کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے باشندوں خصوصاً راجپوتوں میں جو مغائرت و نفرت چلی آتی تھی، اور جو باوجود لگاتار کوشش کے بالکلیہ دور نہ ہوتی تھی۔ اس کا سرے درمرے خاتمہ ہو گیا۔ ہندوؤں کے وجود۔ اُن کے خیالات کا اثر۔ اُن کے مراسم، اُن کی محبت و رفاقت

مسلمانوں اور ان کی سلطنت کے دل وجگر میں پیوست ہو گئی۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے ہندوؤں نے حاصل کئے۔ مسلمانوں کو اپنی مد مقابل حریف قوم کے ہر وقت کے رشک وحسد سے ایک حد تک نجات مل گئی بلکہ اپنا خون مل جانے کے باعث شریک خود محافظ سلطنت ہو گیا۔ چنانچہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ شاہجہاں کو وقت پر اپنے ماموں اور نانا سے بھی مدد ملی تھی۔ اس یگانگت واتحاد نے یہاں تک توغل کیا کہ مسلمانوں کے عقائد بھی ہندوؤں کی توہم پرستی کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

تمدن پر اثر | رانی جودہ بائی وغیرہ کے رشتہ نے ہندو مسلمانوں، خصوصاً شاہی خاندان تیموریہ کو ایسا گھی کھچڑی کیا کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ مشہور ہو گیا۔ ان شادیوں سے مسلمانوں کے ترکی تمدن میں جس میں ایرانی وعربی تمدن کی آمیزش تھی، ہندوی تمدن کا جزو غالب شامل ہو گیا۔ اس میں کلام نہیں کہ تمدنی اتحاد دیگر ذرائع سے بھی ہوا مگر جودہ بائی وغیرہ کے آنے سے گھر کے اندر ہندی تمدن نے جگہ پکڑ لی۔ شادی مہمانی کی بہت رسمیں، بلکہ حکومت کے متعلق بہت سی ایسی رسمیں تھیں جو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں رانیوں خاص کر جودہ بائی کے سبب سے خاندان تیموریہ میں رائج ہوئیں۔ مثلاً مایوں بٹھانا۔ دوسری خوشبودار چیزوں کے ساتھ ہلدی کی آمیزش کا ابٹنا دولہا دلہن کے ملنا دہلدی

کی آمیزش ہندویت کی نشانی ہے۔ کیونکہ اس ملک میں یہ چیز رنگ نکھارنے کے لئے مخصوص ہے) کنگنا باندھنا۔ منڈھا کھڑا کرنا۔ چوک پُرانا۔ سہرا باندھنا تیل چڑھانا دولہا کے سر پر راجہ شاہی پگڑی باندھنا گلے میں جامہ پہننا شادی میں مہمانوں کا باہم ابٹنا اور رنگ کھیلنا اور رنگ کھیلنا۔ سمدھیوں کو گالیاں دینی (ہندوؤں میں گالیاں دینے کی رسم عام ہے جس کو سیٹھنیاں کہتے ہیں) وغیرہ وغیرہ اور بہت سی جزوی رسمیں ہیں ان کے علاوہ ہولی اور دیوالی کی رسمیں تھیں کہ بادشاہ راجہ شاہی پگڑی باندھتے تھے جامہ پہنتے تھے۔ راکھی پونم کے دن ایک ایسے معزز ہندو خاندان (جس کو راجائی بلکہ میرزائی خطاب ہوتا تھا) کی خاتون بادشاہ کی کلائی میں راکھی باندھتی تھی (حضرت بہادر شاہ مرحوم کے زمانے تک یہ رسم جاری تھی۔ چنانچہ راجہ میرزا بھولا ناتھ اور راجا میرزا کدار ناتھ کے خاندان کی ایک لیڈی یہ رسم ادا کیا کرتی تھی اور حسب رواج بادشاہ کی بہن سمجھی جاتی تھی۔) جشن کے دن بادشاہ بیگم ناک میں نتھ پہن کر آدھی رات کی نوبت کے وقت کڑھائی میں پڑ ڈالتی تھیں۔ وغیرہ اور بہت سی ہندوی رسمیں تو اور مسلمان خاندانوں میں بھی رائج ہو گئیں۔ کیونکہ ایک زمانے میں خاندانِ شاہی کے تمدن کی عام طور سے تقلید کی جاتی تھی اور بہت سی رسمیں ایسی تھیں جو فقط خاندانِ تیموریہ ہی میں رہ گئیں جن میں سے بعض اب

تک برتی جاتی ہیں بعض لغو سمجھ کر یا افلاس کے سبب سے چھوڑ دی گئیں۔ اور بعض سلطنت کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

ہمارے زنانہ لباس کے بھی بعض مخترعات رانی جودہ بائی کی طرف منسوب ہیں۔ خصوصاً تہ پوشی یعنی کلیوں دار پائجامہ۔ یہ قطع پیجامہ کی ظاہر ہے کہ نہ عرب سے آئی نہ ایران و توران نہ خراسان و افغانستان سے نہ ہندوستان میں قدیم سے۔ کہیں یہ وضع رائج تھی۔ البتہ لہنگا ہندن کا خاص لباس ہے۔ اسی سبب سے بعض قطعات ہند کے مسلمانوں میں بھی لہنگے کا رواج ہو گیا ہے۔ مگر اُن کا لہنگا بھی بس اسی حد و مقدار پر ہے جس پر کہ ہندی بہنوں کا لہنگا ہے۔ اس عام لہنگے کی قطع یہ ہے کہ صرف پاٹ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلیاں نہیں ہوتیں۔ گھیر بھی اوسط درجے کا ہوتا ہے۔ البتہ راجپوتانہ خصوصاً مارواڑ کا لہنگا کلیوں دار تیس تیس چالیس چالیس گز کے گھیر کا ہوتا ہے۔ مارواڑ رانی جودہ بائی کا دیس تھا، ضرور اُن کا لہنگا بھی اسی گھیر گھار کا ہو گا۔ مگر ان کی اختراع پسند طبیعت نے میکے سسرال دونوں جگہ کی وضع میں سے ایک نئی وضع تہ پوشی کی پیدا کی۔ اپنے اختراع کے ابتدائی زمانے کے بہت دن بعد تک ڈھیلا پائجامہ اتنا ہی اونچا رہا جتنا کہ لہنگا ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی وضع میں کئی ترمیمیں ہوئیں۔ پھر کلیاں ڈھلک کر لگنے لگیں

اور وہ وضع قائم ہوئی جو آج تک رائج ہے۔ زیورات میں بھی رانی جودھ بائی کی شاہانہ طبیعت نے غالباً بہت کچھ تغیر و تبدل کیا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے بہت سے زیور ایسے ہیں جن میں ہندویت و اسلامیت دونوں مذاق ہویدا ہیں۔ ہاں ایسے زیور جیسے نتھ وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ رانی موصوفہ باز یادہ سے زیادہ ان کی پیش رو رانیوں ہی کی تقلید سے مسلمانوں خصوصاً خاندانِ تیموریہ میں رائج ہیں۔

بیاہی ہوئی زندگی دنیا کا قاعدہ ہے کہ جہاں پھول ہے وہاں کانٹا بھی ہے۔ جہاں آسائش ہے وہاں کاہش بھی موجود ہے۔ رانی جودھ بائی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ جہاں اُن کو یہ قابلِ رشک مرتبہ حاصل تھا کہ وہ شاہی خاندان کی بیٹی، بہو اور بیوی تھیں۔ وہاں اُن کی زندگی کے اعلیٰ درجے کے حظ کو منغص کرنے کے لئے نورجہاں جیسی رقیب کا کانٹا بھی موجود ہوگیا تھا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس قیامِ منزل زندگی کو بڑے صبر و تحمل اور شاہانہ حوصلہ کے ساتھ طے کیا۔ اور سوکناپے کی جلن میں اپنی زندگی کو سوختہ کرنے کی بجائے اپنے خیالات کو ان باتوں کی طرف مبذول رکھا جو ہر متمدنہ عورت کے شایانِ شان ہیں یعنی مذہبی اور تمدنی معاملات کی دلچسپی میں انھوں نے اپنا وقت گزارا۔ مذکورہ بالا ایجادات و اختراعات وغیرہ کے انہماک سے اُن کی

متمدنانہ لیاقت و دلبستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے وہ اپنی شہرۂ آفاق سوکن کے مقابل میں خصوصاً مقابلہ کے وقت گنجائی اور کچھ بھی نہیں تھیں۔ اگرچہ نور جہاں بیگم کے اقبال نے بقول مولوی محمد حسین صاحب آزاد کے "رانیوں اور مہارانیوں کے چراغ گل کر دئے تھے۔ (یہ اشارہ مولوی صاحب نے جودہ بائی کی طرف کیا ہے) مگر حقیقتاً وہ چراغ الفت و محبت تھے جو ٹمٹما گئے تھے، نہ کہ چراغ وقعت: عظمت خود جہانگیر کے اقتدار میں نہ تھا کہ قدرت نے جو درجہ جودہ بائی کا اُن کے محل بلکہ ان خانۂ دل میں قائم کر دیا تھا وہ اس کو زائل کر سکیں۔

حاضر جوابی | ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ جہاں پناہ رانی موصوفہ کے محل میں تشریف لائے اور رانی سے کہنے لگے: "نور جہاں کہتی ہے کہ آپ کے دہن سے جو خوشبو آتی ہے وہ کسی کے منہ میں سے نہیں آتی کیا یہ سچ ہے؟" مہارانی نے جواب دیا کہ "میری شامہ نے کوئی دوسری بو نہیں سونگھی ہے جو حضور کے اور غیر کے بوئے دہن میں تمیز کر سکوں" فی الواقع یہ وہ جواب تھا جس کے دینے کی رانی جودہ بائی حقدار تھیں۔ بادشاہ نے بھی جیسا جواب تھا ویسا وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے

نور جہاں بیگم کو زک دینی | اللہ اکبر رے طبیعت کی شوخی! ایک دفعہ کچھ دل میں جو آئی تو بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب سوجھی۔ حضرت بیوی (حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام

کی نیاز کے بلاوے تمام امرار کی بیویوں کو بھیجے، اور نور جہاں بیگم کو بھی بلایا بیگم بڑے ٹھاٹھ سے سوکن کے ہاں آئیں۔ محفل اتحاد گرم ہوئی۔ محفل میں یا کسی مقام پر نیاز کا سامان تیار ہوا۔ جب نیاز ہو چکی اور معلوم ہوا کہ اب سب کو جاکر نیاز کا کھانا کھانا چاہیے تو نور جہاں بیگم بھی جانے کے لیے آمادہ ہوئی ہوں گی مگر اتنے ہی میں مہتمہ نیاز نے تمام حاضرین بیگمات اور بیوی زنوں کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ یہ حضرت خاتون محشر کی نیاز ہے۔ لہٰذا ایسی پاک بیوی کی نیاز کا کھانا کھانے وہی بیبیاں تشریف لے چلیں جو یک شوہری ہوں۔ تمام بیبیاں جو ایسی ہی ہوں گی اور غالباً رانی کے طرفداروں میں اور اس چشمک آمیز سازش میں شریک ہوں گی، کھڑی ہو گئیں اور جو اس صفت سے خارج تھیں وہ بیٹھی رہ گئیں۔ نور جہاں بیگم کو ناگوار تو بہت گزرا ہوگا لیکن کیا کر سکتی تھیں۔ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ رانی نے گو بہیم طور سے اصرار کیا مگر نور جہاں نے "اس نیاز کے قابل آپ ہی ہیں۔ تشریف لے جائیے" کہہ کر اپنی خفت مٹائی۔ اور بادشاہ سے جاکر بہت شکایت کی۔ بادشاہ نے رانی سے باز پرس کی رانی نے نہایت اعتقاد سے کہا۔ کیا کروں یہ نیاز ہی ایسی مطہرہ مقدس بیوی کی ہے کہ ہما شما نہیں کھا سکتے" نور جہاں کی یہ زک مشہور رہے اور بیوی کی نیاز کی اہلیت یہی واقعہ ہے

اولاد | باوجود نورجہاں جیسے زبردست مدمقابل کے دور دورہ کے قدرت نے جو بیاہتا بیوی ہونے کی وجہ سے اُن کو اصل بادشاہ بیگم بنایا تھا وہ یوں بھی قائم رکھا کہ ولی عہد سلطنت شہزادہ خرم انھیں کے بطن سے پیدا ہوا شہزادۂ ممدوح الملقب بہ شہاب الدین شاہجہاں کی پیدائش کے بعض گیت اب تک یادگار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ملک ہند خصوصاً دارالخلافہ سے لگا کر مارواڑ تک خرمی و شادمانی کا غلغلہ بلند ہو گیا تھا اور انبساط و طرب کا مینہہ برس رہا تھا۔ متوسلین اور اہل استحقاق نے جھگڑ جھگڑ کر اپنے انعامات لئے اور بادشاہ و شہزادہ کی سرکار سے دل کھول کر اُن کے دامنِ مراد پر کئے گئے۔ یہ گیت زچہ گیریاں کہلاتی ہیں۔ دلی میں شاید اور خاندانوں میں بھی گائی جاتی ہیں۔ مگر تیموریہ خاندان کے کسی گھر میں جب زچہ خانہ ہوتا ہے تو ذیل کی دونوں زچہ گیریاں ضرور گائی جاتی ہیں ان کے مضامین سے اس وقت کی دولت مندی، فارغ البالی۔ شہزادہ کے پیدا ہونے کی خوشی اور رانی جودہ بائی کے میکے کا حال اور وہاں کے تعلقات کی کیفیت ہوبہو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زچہ گیری نمبر ۱

ملنگے ہے جودھاجی کا راج   للّٰہ جی[۱] کا نال نہ چھوڑے

۱۔ لالہ جی

تھال بھر موتی جودھ رانی لائیں ۔ وہ بھی نہ لیوے پر دائی ۔ للہ جی الخ

غرض ساری زچہ گیری اسی طرح ہے کہ تھال بھر موتیوں کے علاوہ شال دوشالے جودھ رانی لائیں اور ہاتھی گھوڑے جودھ رانی لائیں مگر دائی کے خطرے میں کوئی چیز نہ آئی ۔ وہ جودھا جی یعنی جہانگیر کا آدھا راج پاٹ ہی انعام میں لینے پر اڑی رہی ۔

نمبر ۲

میرے بابل کو لکھیو سندیس

جھنڈولا آج ہوا ۔

بابل ہمارے نگری کے راجہ ۔ تو بیرن بلے دیس

جھنڈولا آج ہوا

رس بھری کھچڑی لا موسے بابل ۔ تو نوبت باجے ہمیش

جھنڈولا آج ہوا

نوٹ : تحقیقی طور سے ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ رانی ممدوحہ کسی کے زور ظلم سے بلکہ اپنی رضا و رغبت سے مشرف باسلام ہو گئی تھیں چنانچہ بیوی کی نیاز والا مذکورہ بالا واقعہ بھی ان کے اسلامی عقائد کا شاہد ہے ۔

راجہ جودہ بائی کے باب میں غلطیاں | ایک ہندی رانیوں کے تذکرہ میں میں نے دیکھا کہ صاحب تذکرہ نے رانی موصوفہ کو خود اکبر کی بیوی بیان کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ شاہنشاہ اکبر کی بیوی جو تھیں وہ راجہ بھارا مل والی جے پور کی بیٹی تھیں۔

ممتاز محل

از ہمہ خوباں برعنائی یگانہ بودہ
وز جمال خویش در عالم فسانہ بودہ

ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل مرزا غیاث بیگ طہرانی وزیر اعظم جہانگیر کے پوتے یمین الدولہ آصف خاں کی بیٹی اور نور جہاں بیگم کی بھتیجی تھی ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں پیدا ہوئی۔ نہایت حسین اور صاحب جمال تھی۔ فہم و فراست میں بھی نور جہاں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی پائی تھی اس لیے شاہنشاہ جہانگیر نے اپنے بیٹے شاہجہاں کے ساتھ شب جمعہ ۹ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں شادی کر دی تھی۔ اس وقت شاہجہاں کی عمر بیس سال اور گیارہ مہینے کی تھی اور

اور ارجمند بانو بیگم کی عمر ۱۹ سال سات مہینے تیرہ روز کی تھی۔ بڑے شان اور جلوس سے بیاہ کر آئی اور ممتاز محل خطاب پایا۔ بزم شادی مرزا غیاث کے گھر منعقد ہوئی۔ شاہ جہانگیر خود تشریف لے گئے اور اپنے ہاتھ سے نوشہ کے عمامہ پر موتیوں کا ہار باندھا۔ مہر پانچ لاکھ مقرر ہوا۔

اس سے ایک سال آٹھ مہینے پہلے شاہ اسمٰعیل صفوی فرماں روائے فارس کے پوتے مظفر حسین مرزا کی بیٹی سے شاہجہاں کا عقد ہو چکا تھا جو قندھاری بیگم کے لقب سے مشہور تھی۔ اس سے ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی، جس کا نام پرہیز بانو بیگم تھا۔ ممتاز محل کے حسن و جمال فہم و فراست کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ شاہجہاں کے دل کو جس میں قندھاری بیگم نے اتنی مدت سے جگہ کر لی تھی ایک دم میں اپنی طرف مائل کر کے اپنی الفت و محبت کا سکہ جما دیا۔ اور محبت بھی ایسی جس کا خمار جیتے جی نہ اترا بلکہ مرنے کے بعد بھی جدا نہ ہوئی سچی محبت اسے کہتے ہیں۔

ممتاز محل سے شاہجہاں کو وہی نسبت تھی جو جہانگیر کو نور جہاں سے تھی، جس طرح نور جہاں نے اپنی خداداد قابلیت سے جہانگیر کے چشم و دل میں گھر کر لیا تھا اسی طرح ممتاز محل نے شاہجہاں کو مسخر

کر لیا تھا۔

ممتاز محل اپنی ذاتی قابلیت اور حسن و جمال میں نور جہاں بیگم کے ہم پلہ تھی بلکہ نور جہاں بیگم کو وہی لوگ جانتے تھے جنھوں نے تاریخ کی ورق گردانی کی ہے۔ لیکن ممتاز محل سے دنیا بھر کا بچہ بچہ واقف ہے۔ کونسی بیگم ایسی خوش نصیب گزری ہے جس کے مدفن پر ہزاروں کوس سے مختلف ملک اور مختلف مذہب اور قوم کے لوگ صرف دیکھنے کو آیا کریں اور اپنے ملک میں واپس جا کر اس پر فخر و مباہات کریں۔

شاہجہاں کو ممتاز محل سے دلی محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی ایک لمحہ کو بھی اس کی مفارقت گوارا نہ کی۔ یہاں تک کہ لڑائیوں میں بھی ہمیشہ ساتھ ہی رہی۔

دکن کی مہمات میں یہ دور اندیش صائب الرائے بیگم شاہجہاں کی مشیر رہی اور پولیٹکل معاملات میں بھی کچھ مدد دی تھی۔ ۱۶۲۹ء تک ممتاز محل اور شاہجہاں دکن میں نہایت عیش و نشاط کے ساتھ انتظام ملکی میں مصروف رہے۔ اب تک نور جہاں بھی آصف خاں کے مراتب کی وجہ سے شاہجہاں سے موافق اور اس کی معاون رہی شاہجہاں کو سلطنت جہانگیری میں بڑا دخل تھا۔

اسی سال نورجہاں بیگم نے اپنی بیٹی کی شادی (جو شیر افگن خاں سے تھی) جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے کر دی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ نورجہاں بیگم شاہجہاں سے خلاف اور شہریار سے موافق ہو گئی۔ اس کی دلی خواہش یہ ہوئی کہ شاہجہاں کی قوت کم ہو اور بعد جہانگیر کے سلطنت شہریار کے قبضۂ اقتدار میں رہے۔ اسی بنا پر اس نے سازشیں شروع کیں اور اس فکر میں رہنے لگی کہ جہانگیر شاہجہاں سے متنفر ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا ہر چند شاہجہاں نے کوشش کہ باپ سے صفائی ہو جائے مگر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ جہانگیر نے ایک بڑا لشکر شاہجہاں کی گرفتاری کو بھیجا۔

سلطان پرویز اور مہابت خاں اس کے سردار تھے شاہجہاں یہ خبر پاکر برہانپور سے بھاگا کبھی شاہانِ دکن کے یہاں اور کبھی بنگالہ میں پناہ لی۔ الغرض آٹھ برس تک معتوب رہا۔ اس بدامنی اور اضطراب کی حالت میں بھی اپنی محبوبہ ممتاز محل کو اپنی جان کے ساتھ ہی رکھا۔ جب جہانگیر کا انتقال ہو گیا تو شاہجہاں نے دارالخلافہ کی طرف رُخ کیا اور آصف خاں کی کوشش سے نہایت شان و شوکت سے تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر شاہجہاں اور ممتاز محل کو جو خوشی حاصل ہوئی اس کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔

شاہجہاں نے دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ ملکہ ممدوحہ کو بطور انعام عطا کیا اور دس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کی۔

ایام جشن نوروز میں پچاس لاکھ کے زیورات منظور کیے ۱۰۲۹ھ ۱۶۲۹ء میں سالانہ وظیفہ میں دو لاکھ اور اضافہ کیا۔

عہد شاہجہاں میں ممتاز محل کو سلطنت میں وہی دخل تھا جو جہانگیر کے زمانے میں نور جہاں بیگم کو تھا۔ چنانچہ شاہجہاں نے تخت نشینی کے بعد شاہی مہر اپنی معتمد اور لائق بیگم کو دے دی۔ تمام فرامین پہلے شاہی محل میں جاتے اگر مناسب ہوتے تو ان پر مہر ثبت کی جاتی ورنہ بغرض تحقیق مزید علیحدہ رکھ دئے جاتے۔

کچھ عرصے کے بعد ممتاز محل کی سفارش سے مہر یمین الدولہ آصف خاں کو مرحمت ہوئی اور منصب نو ہزاری بھی عطا ہوا۔ پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر منظور ہوئی سچ ہے لعل پیارا تو اس کا خیال بھی پیارا ممتاز محل کی بدولت آصف خاں کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ کوئی آرزو باقی نہ رہی اکثر کہا کرتے کہ میری صرف یہی حسرت باقی ہے کہ بادشاہ کے سامنے ہی دنیا سے رخصت ہوں۔

ممتاز محل نہایت درجہ رحم دل تھی (اور یہ صنفِ نازک کا وصف عام ہے) غریبوں کی فریادرسی اور ان سے ہمدردی۔ بیواؤں اور

بیواؤں اور مساکین کی خبر گیری اور امداد کنواری لڑکیوں کی شادی کا انتظام و اہتمام یہ اس کی روزانہ ضروریات میں سے تھا ستی النساء بیگم (اس کی مصاحبہ جس کا مقبرہ تاج گنج سے ملا ہوا ہے) ان اُمور کی منتظمہ تھی۔

سیکڑوں قاتل و مجرم اس کی سفارش سے رہا ہوگئے اور بہت سے معتوب متوسلین سلطنت اپنے عہدوں پر بحال کرا دیئے۔

شاہجہاں برہانپور ملک دکن میں خان جہاں لودی کی سرکوبی کی غرض سے خیمہ زن تھا کہ ۱۷ ذیقعدہ کو دفعتہً ممتاز محل علیل ہوگئی آدھی رات کے بعد لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی تکلیفیں برابر بڑھتی گئیں یہاں تک کہ غش پر غش آنے لگا۔ آخر کار زندگی سے مایوس ہوگئی۔ تب شہزادی جہاں آرا کو جو اس کے پاس بیٹھی تھی اشارہ کیا کہ زنانہ کمرے کی راہ سے بادشاہ کو بلا لاجے۔ اس وقت تین گھڑی رات باقی تھی۔ بادشاہ گھبرا کر فوراً آئے اور سرہانے بیٹھ گئے۔ ممتاز محل نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں کھول کر نظر یاس سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ میرے بعد میری اولاد سے غافل نہ ہونا اور میرے بیکس والدین کی بھی خبر گیری کرتے رہنا پھر دوبارہ گہری نگاہ اپنے عمر بھر کے رفیق کو دیکھ کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

اس حادثہ جانکاہ سے قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ بادشاہ کے غم والم کا کیا بیان ہو۔ ہفتوں تک کسی امیر کی صورت نہیں دیکھی نہ کبھی جھروکہ پر انتظام ملکی کی غرض سے نمودار ہوئے۔ دو برس تک برابر اسی صدمے میں تمام مسرت انگیز باتیں چھوڑ رکھی تھیں۔ یہاں تک کہ لذیذ کھانوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ عید وغیرہ کی تقریبوں میں جب اور بیگمات خدمت میں حاضر ہوتیں تو ان میں اپنی محبوبہ کو غائب پاکر زار زار روتے جب کبھی اس کی خوابگاہ میں پہنچ جاتے تو آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔

مُلّا عبد الحمید لاہوری لکھتے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے بادشاہ کے دس بیس بال سفید تھے، مگر ممتاز محل کی مفارقت سے چند ہی روز بعد فرطِ غم سے تمام بال سفید ہو گئے۔ سچی محبت ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ دونوں ایک جان دو قالب کے مصداق تھے۔ ایک کی زندگی گویا دوسرے کی حیات پر منحصر تھی۔ جب باہمی تعلق اس حد پر پہنچ گیا ہو تو ایک کے فراق جاودانی سے دوسرے کو جس قدر صدمہ ہو کم ہے۔

کیسی خوش قسمت بیگم تھی کہ اپنے قدر دان کے سامنے دنیا سے کوچ کیا۔ اگر شاہجہاں کے بعد مرتی تو آج اس شان و شوکت سے تاج محل میں سوتی ہوئی نظر نہ آتی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اپنا وارث اپنا

سرتاج، اپنا بادشاہ اپنے پاس۔ خدا ہر بیوی کو یہ مرتبہ عطا فرمائے روضۂ تاج گنج میں دونوں قبریں دیکھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دونوں رفیق جانی پہلو بہ پہلو قیامت کی نیند سو رہے ہیں۔

ممتاز محل کی نعش کو مشرقی دستور کے مطابق باغ زین آباد واقع برہان پور متصل دریائے تاپتی میں بطور امانت دفن کر دیا۔ جمعرات کے روز ۲۰ تاریخ سہ پہر کو بادشاہ باغ زین آباد میں گئے اور اپنی جوان مرگ حسرت نصیب بیوی کی عارضی قبر پر فاتحہ پڑھی اور جب تک برہان پور میں رہے یہی معمول رہا کہ ہر جمعہ کو فاتحہ خوانی کی غرض سے وہاں جاتے اور اپنا رنج و غم تازہ کرتے تھے۔ چھ مہینے بعد جمعہ کے روز ۱۷ جمادی الاول ۱۰۴۱ھ کو ملکہ کی نعش شہزادہ محمد شجاع اور ستی النساء خانم کی حفاظت میں برہان پور سے آگرہ روانہ ہوئی۔ جہاں آرا بیگم اور وزیر خاں طبیب بھی ساتھ تھے۔ حکم شاہی کے موافق برہان پور سے آگرہ تک فقرا اور مساکین کو کھانا اور روپیہ بکثرت بطور خیرات تقسیم کرتے ہوئے آئے۔ چھ مہینے تک مرحومہ کی نعش کو روضۂ تاج گنج کے صحن باغ میں بطور امانت سپرد کیا۔ بعدہٗ اصل مقبرہ میں دفن کیا۔

ملا محمد صالح لکھتے ہیں کہ اس حادثے کے بعد ہر سال جب ذیقعدہ کا مہینہ آتا تو بارگاہ شاہجہاں میں تعزیت کا سامان ہوتا۔ بادشاہ

سپید پوشاک پہنتے اور تمام امرا وغیرہ ماتمی لباس میں نظر آتے تھے۔
ممتاز محل کے تمام سامان خانہ داری جہاں آرا بیگم کے سپرد ہوئے
اور سالانہ وظیفہ جو ممتاز محل کے لئے مقرر تھا اس میں چار لاکھ کا اضافہ
کر کے جہاں آرا بیگم کو منتقل کر دیا تھا جو آدھا نقد اور آدھا جاگیر کی
صورت میں تھا۔ مرزا اسحاق بیگ یزدی جو ممتاز محل کے میر سامان
تھے وہ جہاں آرا بیگم کے دیوان کر دیئے گئے اور ستی النساء خانم بدستور
امور خانگی میں منتظم رہیں اور مہر بھی انہیں کے سپرد کر دی گئی۔
ممتاز محل کے آٹھ لڑکے چھ لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں مگر وفات
کے وقت صرف سات زندہ تھے۔ جہاں آرا بیگم۔ محمد دارا شکوہ
محمد شاہ شجاع۔ روشن آرا بیگم۔ اورنگ زیب۔ مراد بخش اور گوہر آرا بیگم
جس کی پیدائش کے وقت ممتاز محل اس جہاں سے گذر گئی۔

جہاں آرا بیگم

جہاں آرا بیگم صاحبقراں ثانی محمد شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ دہلی کی لاڈلی بیٹی تھی۔ عمر میں اپنے بھائی عالمگیر سے بڑی تھی۔ ۱۰۲۳ھ میں وہ پیدا ہوئی۔ اس کی ماں ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل تھی جس کا مقبرہ آگرہ میں ہے اور جو دنیا میں لحاظ خوب صورتی کے بے نظیر و بے مثل ہے۔

جہاں آرا جب سن شعور کو پہنچی تو اس کی تعلیم صدر النسا خانم عرف ستی النسا خانم کے سپرد ہوئی۔

ستی النسا خانم مشہور شاعر طالب آملی کی ہمشیرہ تھی جو عہد جہانگیر کا ایک ممتاز سخنور تھا اور وہ نصیرا شاعر کی بیوی تھی جو حکیم رکنا کاشی کا بھائی تھا۔

ستی النسا خانم نے جہاں آرا بیگم کو پہلے کلام مجید پڑھایا۔ اس کے بعد فارسی نثر و نظم اور علم قرأت کی تعلیم دی اور تھوڑے ہی زمانے میں لکھنے پڑھنے میں اس کو ہوشیار کر دیا۔ علاوہ بریں اس کے دل

میں کتب بینی کا شوق پیدا کر دیا جس کو اس نے عمر بھر قائم رکھا۔

جہاں آرا نہایت درجہ حسین شہزادی تھی اور بہت شان شوکت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی سالانہ جاگیر دس لاکھ روپے کی تھی۔ علاوہ بریں بوجہ اس کے کہ شاہجہاں اس کو اپنی تمام اولاد میں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ادنیٰ ادنیٰ تقریبوں میں ہزاروں لاکھوں روپے بطور انعام واکرام کے اس کو ملا کرتے تھے۔

جہان آرا کا محل شاہجہاں کے عالی شان محل سرا کے متصل دریائے جمن پر واقع تھا۔ اور نہایت دلفریب نقش ونگار سے مزین تھا۔ اس کے در و دیوار پر اعلیٰ درجہ کی پچیکاری کی ہوئی تھی اور جا بجا گراں بہا جواہرات نہایت خوب صورتی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

اس کی سواری بڑی شان و شوکت کے ساتھ نکلتی تھی۔ اکثر تو وہ چوڈل پر نکلتی تھی جو تخت رواں کے مشابہ ہوتا تھا اور اس کو کہار اٹھاتے تھے۔ اس کے ہر طرف روغن کاری کا کام بنا ہوا ہوتا اور ریشمی دلکش گھٹا ٹوپ پڑے ہوتے تھے۔ ان میں زری کی جھالر اور خوب صورت پھندنے لٹکے ہوتے تھے جن سے اس کی زینت دوبالا ہو جاتی تھی۔

اور کبھی کبھی وہ بلند اور خوب صورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا کرتی تھی جس پر نہایت زرق برق اور شاندار ہودج کسا ہوتا تھا اس کے پیچھے پیچھے خواجہ سرا بیش قیمت گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ ایک رسالہ تاتاری عورتوں کا بھی ہمرکاب ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پیدل ملازمین کی ایک جم غفیر بھی ساتھ ہوا کرتی تھی۔

جہاں آرا بیگم کی شادی عمر بھر نہیں ہوئی۔ اور یہ صرف اسی بیگم پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس خاندان کی اکثر بیگمات کی شادی نہیں ہوئی۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ ملکی بنیاد پر شاہان مغلیہ اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ جن لوگوں سے اس قسم کے تعلقات پیدا ہوئے وہ بغاوت سے باز نہیں رہے۔ اس کے علاوہ ان بیگمات کے شادی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے لئے ایسے لوگ بھی مشکل سے مل سکتے تھے جو بلحاظ عزت و حرمت کے شاہان مغلیہ کے نزدیک اس قابل ہوں کہ ان کے ساتھ شاہزادیوں کا نکاح کیا جائے۔

باوجود اس امر کے کہ جہاں آرا کی شادی نہیں ہوئی۔ اس نے نہایت پاکبازی کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ اور زندگی بھر زہد و صلاح اس کا شیوہ رہا۔ برنیر و ٹیورنیر وغیرہ سیاحان یورپ نے جو بے سروپا افسانے اس عصمت مآب بیگم کے متعلق لکھے ہیں وہ حد سے زیادہ غلط ہیں۔

اور ان کی کافی طور پر ہم نے اپنی کتاب "جہان آرا" میں تردید کر دی ہے۔

جہان آرا کو اولاد کا بہت شوق تھا۔ اس نے دارا شکوہ کے قتل کے بعد اس کی بیٹی جہاں زیب بانو بیگم کو متبنی کر لیا تھا اور عمر بھر اس کو بطور اولاد کے رکھا۔ جب اس کی شادی عالمگیر کے بیٹے شاہزادہ محمد اعظم کے ساتھ ہوئی تو جہاں آرا نے اس تقریب میں اپنی جیب خاص سے سولہ لاکھ روپے صرف کئے تھے۔

جہان آرا بیگم بڑی فاضلہ عورت تھی۔ اس کی کتاب مونس الارواح نہایت معروف و مشہور ہے۔ یہ کتاب اس نے ۱۰۴۹ھ میں تصنیف کی جبکہ اس کی عمر چھبیس ۲۶ سال کی تھی۔ اس کتاب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء کے حالات اس نے نہایت بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ بیگم مذکور کو خواجہ صاحب کے ساتھ دلی عقیدت تھی چنانچہ اس کتاب کو سب سے پہلے اس نے خواجہ صاحب کے مزار پر چڑھایا جو اب تک وہاں موجود ہے۔

اس نے خواجہ صاحب کے روضہ مبارک میں ایک عالی شان دالان بھی تعمیر کرایا جس پر تمام زرین کام کیا ہوا ہے۔ اس کے دیوار کے نقش و نگار نہایت دلفریب ہیں اور جا بجا جواہرات کی پچیکاری

کی گئی ہے۔

یہ بیگم نہایت درجہ سخی اور فیاض تھی۔ عام طور پر غربا و مساکین اس کی دریا دلی سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ سیکڑوں بیواؤں کی تنخواہیں اس کے یہاں سے مقرر تھیں اور ہزاروں غریبوں کی لڑکیوں کی اس نے اپنے صرف سے شادیاں کرا دیں۔ شعرا اور ارباب کمال اس کے انعام و اکرام سے اکثر متمتع ہوا کرتے تھے۔

حاجی محمد جان قدسی نے اس کے جل جانے کے موقع پر ایک پُر زور قصیدہ لکھا۔ بیگم صاحبہ کو اس کا ایک شعر پسند آیا اور اس کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ عطا کیا۔ وہ شعر یہ ہے۔

تا سر زدہ از شمع چنیں بے ادبی
پروانہ زعشق شمع را سوختہ است

مرزا محمد علی ماہر نے ایک مثنوی بیگم صاحبہ کی تعریف میں لکھی ہے اس کا بھی ایک شعر بہت پسند کیا اور پانچ سو روپیہ انعام دیا۔

بذات او صفات کردگار است
کہ خود پنہاں و فیضش آشکار است

جہاں آرا بیگم ایک مرتبہ جلتے جلتے جان سے بچ گئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ستائیس محرم ۱۰۵۳ھ کو اس کی سالگرہ کے جشن کا دن تھا اتفاق

سے اس کے کپڑوں میں جو عطر سے بسم تھا شمع کے ذریعے سے آگ لگ گئی۔ بیگم ایسی حیادار عورت تھی کہ شرم سے اس نے ذرا بھی شور و غل نہ کیا کیونکہ اس کو خوف تھا کہ امراء جو اس جگہ سے قریب بیٹھے ہوئے تھے اس کی آواز سُن لیں گے۔ وہ دوڑ کر زنانے کمرے میں پہنچی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ دو تین لونڈیاں جو آگ بجھانے میں مشغول ہوئیں وہ بھی جل گئیں۔ شاہجہاں بادشاہ کو اس واقعہ سے بہت رنج ہوا۔ چار ماہ تک اس نے سلطنت کا کوئی کام نہیں کیا۔ ہمیشہ بیگم صاحبہ کی تندرستی کے لئے نہایت خلوص کے ساتھ دعائیں مانگتا تھا۔ اس نے یہ منت مانی تھی کہ اگر جہان آرا اچھی ہو گئی تو پانچ لاکھ روپے خیرات کروں گا اور حضرت خواجہ صاحب کی زیارت کو بھی جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ کے زمانہ علالت میں اس نے سات لاکھ روپے غربا میں تقسیم کیے۔ اور ہزارہا قیدیوں کو رہا کر دیا۔

بیگم صاحبہ کے علاج کے لئے حکیم محمد داؤد بادشاہ ایران کا طبیب خاص مقرر کیا گیا۔ اگرچہ اس کے علاج سے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ مگر بادشاہ نے اس کو بیش قیمت خلعت اور بیس ہزار روپیہ عطا فرمایا۔ اور معزز منصب سے سرفراز کیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر بوسٹن کے علاج سے اس کو

فائدہ ہوا جس کے صلے میں بادشاہ نے ہر جگہ انگریزوں کو تجارت کی کوٹھی بنانے کی اجازت دے دی

اکثر مورخین کا یہ خیال ہے کہ بیگم صاحبہ کو عارف جراح اور ہامون ایک بے نوا فقیر کے مرہم سے فائدہ ہوا۔ بادشاہ ہامون سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ روپیے سے تولا گیا اور اس کے وطن میں اس کو ایک گاؤں بطور جاگیر کے ملا۔ اس کی بیوی نے بہت سے بیش قیمت زیورات پائے اور شاہزادی نے تو اس کو اس قدر دیا کہ عمر بھر کے لئے مستغنی کر دیا۔

بیگم صاحبہ کے غسل صحت کے موقع پر بادشاہ نے بہت دھوم دھام سے جشن کیا۔ دیوان عام کے سامنے نہایت بیش قیمت خیمے نصب کئے گئے۔ شامیانوں کی رسیاں اور تمام ساز و سامان چاندی اور سونے کے تھے۔ زینت کی غرض سے اس میں گراں بہا جواہرات جڑے گئے تھے مختلف ملکوں کے شامیانوں میں خوب صورت قالین بچھائے گئے تھے۔ اور بیچ میں ایک مرصع تخت تھا جس میں لعل اور موتی لگے ہوئے تھے روم اور چین کے مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں اور دل کش پردے بھی آویزاں تھے

شاہجہاں نے اس موقع پر نہایت شان و شوکت سے جلوس کیا۔ اردگرد شہزادے بیٹھے ہوئے تھے۔ زریں کرسیوں پر جابجا مشک اذفر

جلتا تھا۔ گانے والوں کی دلکش آوازوں سے آسمان گونج رہا تھا سینکڑوں کوہ پیکر گھوڑے جن کے کل سامان سونے اور زر بفت کے تھے۔ سامنے کھڑے ہوئے تھے اور ایک طرف بلند اور خوب صورت ہاتھیوں کا مجمع تھا جو بلحاظ اپنے سازو سامان کے قابل دید تھے۔

اس موقع پر بادشاہ نے ہزار مہر اور پانچ ہزار روپیہ غربا میں تقسیم کیا۔ عارف جراح سونے سے تولا گیا۔ اور اس کو ساٹھ ہزار روپے کا خلعت اور گھوڑے اور ہاتھی بطور انعام کے دئے۔ کئی ہزار کے طلائی پھول نچھاور کئے گئے اور بادشاہ نے بیگم صاحبہ پر لاکھوں روپے کے لعل یاقوت نچھاور کئے اور ایک دست بند جس کی قیمت پانچ لاکھ روپے تھی اور ایک موتیوں کی سر بندی جس میں ایک ٹکڑا الماس کا جڑا ہوا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی بیگم صاحبہ کو عطا کیا۔ اور سورت جاگیر میں دیا۔ اور تقریباً ۲۰ لاکھ روپیہ انعام کی مد میں صرف کر دیا شاہزادیوں کو بھی کئی لاکھ روپیہ اور بیش قیمت جواہرات عطا کئے۔ اورنگ زیب عالمگیر پر اس وقت عتاب شاہی تھا بیگم صاحبہ کی سفارش پر بادشاہ نے اس کا قصور معاف کر دیا، اور اس کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں جہان آرا کی کس قدر محبت تھی اور وہ اس وجہ سے تھی کہ جہان آرا نہایت دور اندیش

اور صائب الرائے تھی سلطنت کے اہم معاملات میں بادشاہ اس کی رائے پر عمل کرتا تھا، اور بغیر اس کے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

دارا شکوہ اس وقت ولی عہد تھا اور بہت کچھ کام بادشاہ نے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ جہان آرا، دارا شکوہ کی طرف دار تھی۔ اس لئے وہ اس کو دل سے مانتا تھا۔ ان وجوہات سے بیگم صاحبہ کی ذات سلطنت شاہجہانی میں بہت اہم تھی۔

شاہجہاں کے زوال کے موقع پر جب جہان آرا کے بھائیوں نے چاروں طرف سے فوج کشی کی اس وقت اس نے اس فتنہ کے فرو کرنے میں بہت کوشش کی۔ عالمگیر کو خود کئی خط لکھے۔ اس کے بعد وہ بلا خوف وخطر اس کے پاس گئی اور اس کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا لیکن عالمگیر نے اس کی ایک بھی نہ سنی۔

جب شاہجہاں قید ہو گیا تو جہان آرا نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ وہ جب تک زندہ رہا اس کی خدمت میں برابر مصروف رہی۔ آگرہ کے قلعہ میں جہاں شاہ جہاں قید تھا وہ مقام اب تک موجود ہے وہاں پر وہ سقادہ بھی اب تک موجود ہے جس میں جہان آرا اپنے بوڑھے باپ کے وضو کے لئے خود پانی گرم کرتی تھی۔

آخر ۱۰۷۶ھ میں آٹھ سال قید کی مصیبت جھیل کر جب کہ اس کی خدمت گذار بیٹی اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی نظر اس کی زندگی بھر کی آرام جان بیوی کے خوب صورت روضہ پر جمی ہوئی تھی اس کی روح نے پرواز کیا اور تاج محل کے روضہ میں وہ دفن کیا گیا۔

عالمگیر اس وقت دہلی میں تھا۔ یہ خبر سن کر آگرہ میں آیا۔ بیگم صاحبہ کو ایک لاکھ اشرفی نذر کی اور بہت عزت و توقیر فرمائی، اور بادشاہ بیگم کا خطاب عطا کیا۔

بعد وفات شاہجہاں کے جہاں آرا نے ایک درویشانہ زندگی بسر کی۔ سترہ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر اس کی عالمگیر کے زمانہ میں تھی۔ اس عہد میں اس کو ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خانگی امور میں کبھی کبھی بادشاہ اس کی رائے طلب کیا کرتا تھا۔

روشن آرا بیگم جو اس کی چھوٹی بہن تھی اور جو شورش کے زمانے میں عالمگیر کی طرفدار تھی، اب اس کا عروج ہوا۔ اس کو جہاں آرا سے سخت عداوت تھی۔ اسی وجہ سے جہاں آرا نے تمام تعلقات چھوڑ کر زہد و تقوےٰ سے سروکار رکھا۔

اس کا مذہب مثل اپنے بزرگانِ قدیم کے حنفی تھا۔ مگر تصوف سے اس کو ایک خاص دلچسپی تھی اور خواجہ صاحب سے دلی عقیدت رکھتی تھی

۱۰۹۲ھ میں جہاں آرا نے بمقام دہلی انتقال کیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی۔ عالمگیر اس وقت برہانپور میں تھا۔ اس سانحہ کو سُن کر بہت دیر تک روتا رہا۔

جہاں آرا نے تین کروڑ روپے اپنی وفات کے بعد چھوڑے تھے اور یہ وصیت کی تھی کہ یہ سب روپے حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے خدام کو دے دیے جائیں۔ کیونکہ انھیں کے ذریعے سے بیگم صاحبہ کو اس مقدس روضہ میں مدفن کے لئے جگہ ملی تھی۔ لیکن عالمگیر نے دو کروڑ روپے اس میں سے لے لئے اور کہا کہ از روئے شرع ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

جہاں آرا کا مدفن شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار کے بالکل قریب ہے۔ اس کو بیگم صاحبہ نے خود اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ بالکل سنگ مرمر کا ہے۔ اوپر چھت نہیں ہے۔ تعویذ قبر خام ہے جس پر ہمیشہ سبزہ لہلہاتا ہے اور اس پر یہ عبارت کندہ ہے

ھو الحی القیوم

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا ۔۔۔ کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا بیگم۔ مرید خواجگان چشت بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ

سنہ ۱۰۹۲ھ

جہاں آرا نے اپنی وفات کے بعد بہت سی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنے باپ شاہجہاں کی طرح اس کو بھی عمارتوں کا بہت شوق تھا۔

سب سے بڑی عمارت جو اس نے تعمیر کرائی وہ آگرہ کی جامع مسجد ہے، جو اب تک نہایت آباد ہے۔ یہ عمارت قلعہ معلےٰ کے بالکل قریب واقع ہے۔ پانچ سال میں اتمام کو پہنچی اور تخمیناً پانچ لاکھ روپے اس میں صرف ہوئے۔ یہ مسجد طول میں ایک سو بتیس فٹ اور عرض میں سو فٹ ہے۔ اس کی دیواریں قدآدم سنگ مرمر کی ہیں، اور اس میں پانچ عالی شان دروازے ہیں۔ وسط کا دروازہ چالیس فٹ سے زیادہ عریض ہے سنہ ۱۰۸۰ھ میں متھرا کے بتوں کی جو مورتیں آئی تھیں وہ عالمگیر کے حکم سے اس کے زینے کے نیچے دفن کر دی گئیں۔

بیگم صاحبہ نے ایک مسجد کشمیر میں بھی تعمیر کرائی جس کو مسجد ملا بدخشی کہتے ہیں۔ اس وقت وہ ملا مذکور کی زیارت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر میں چالیس ہزار روپے صرف ہوئے۔

دلی میں اس نے ایک کارواں سرائے بنوائی تھی جس کے متعلق برنیر لکھتا ہے کہ کاش یہ عمارتیں پیرس میں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ ٹوٹتے ٹوٹتے اس عمارت کے بہت کم آثار صفحۂ ہستی پر باقی رہ گئے ہیں۔

عمارت کے علاوہ جہاں آرا بیگم کو باغات کا بھی بہت شوق تھا۔ دہلی میں اس کا ایک نہایت دلکش باغ تھا جو اجھوں کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں خوب صورت بنگلے اور مکانات بنے ہوئے تھے بہت سے حوض اور آبشاریں تھیں جن میں فوارے لگے ہوئے تھے آگرہ میں بھی اس کا ایک باغ تھا جس کو اب سید کا باغ کہتے ہیں۔ اس باغ کو شاہجہاں نے اپنی شاہزادگی کے زمانے میں تعمیر کرایا تھا۔ جب جہاں آرا سن شعور کو پہنچی تو اس کے سپرد کر دیا۔

یہ باغ نہایت آراستہ رہتا تھا۔ بادشاہ بھی کبھی کبھی وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ افسوس جہاں ہر وقت نظر فریب پھول کھلے رہتے تھے، وہاں اب حسرت برستی ہے۔ اور جس باغ میں پری پیکر بیگمات خرام ناز کرتی تھیں۔ وہاں اب عبرت کے سوائے کوئی نظر نہیں آتا ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید ست صنادید عجم را

روشن آرا بیگم

خواتین اسلام میں روشن آرا بیگم وہ عورت ہے جو علمی قابلیت اور فہم و ذکاوت میں نہایت ممتاز تھی۔ یہ اورنگ زیب کی حقیقی چھوٹی بہن تھی اور فطرتاً اس سے بہت کچھ مناسبت رکھتی تھی۔ اس کی مادر مہربان ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل تھی جس کا سایۂ عاطفت عہد طفولیت ہی میں اس کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ شاہجہاں نے اس کو تعلیم کے لئے ستی النساخانم کے سپرد کیا جو ممتاز محل کی بہت عرصے تک مصاحبہ رہی تھی ستی النساخانم مشہور شاعر طالب آملی کی ہمشیرہ تھی جس کو جہانگیر نے ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرار کے خطاب سے سربلند کیا تھا اور وہ نصیرا کی زوجہ تھی جو معروف شاعر حکیم رکنا کاشی کا بھائی تھا۔

ستی النساخانم بڑی قابل عورت تھی۔ فن طب اور قرأت وغیرہ میں اپنے ہم عصروں میں یکتا تھی اور شاعری تو اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ ستی النساخانم نے روشن آرا کو باقاعدہ تعلیم دی جس سے

بہت جلد اُس نے علم و ہنر میں کمال پیدا کیا۔

روشن آرا کی ایک بڑی بہن جہاں آرا تھی جس کی تصنیف سے مونس الارواح ہے اور جو عہد شاہجہاں میں سیاست اور حکومت کی روح رواں تھی، اور بادشاہ پر اس کا اس قدر اقتدار تھا کہ بغیر اس کی صلاح و مشورے کے وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا روشن آرا کو جہاں آرا کے ساتھ حاسدانہ تعلقات تھے اور دونوں میں اسی وجہ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ جب تک شاہجہاں کا آفتاب اقبال درخشاں رہا جہاں آرا کے جاہ و وقعت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی اور اس زمانے تک روشن آرا کے حسد میں اضافہ ہوتا رہا۔

آخر ۱۰۶۷ھ میں روشن آرا کے نصیب نے کروٹ لی، اور شاہ جہاں کی علالت نے اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی برپا کر دی عالمگیر بھی دکن سے بڑے کروفر کے ساتھ دارالخلافہ آگرہ کو روانہ ہوا اور اثنائے راہ میں دارا شکوہ کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا داخل آگرہ ہوا اور یہ کوشش کرنے لگا کہ قلعہ پر کسی طرح قبضہ ہو جائے۔ اس وقت تجربہ کار اور جہاں دیدہ بادشاہ نے اس کو ایک محبت نامہ کے ذریعے سے مدعو کیا اور اورنگ زیب بھی والد بزرگوار کی زیارت پر آمادہ ہو گیا۔ شاہجہاں نے اس موقع پر حفاظت قلعہ کا بہت

کافی انتظام کیا تھا اور اسی غرض سے قلعہ کے اندر بہت سی قلماقنیاں مسلح پہرے پر متعین کردی تھیں۔

روشن آرا نے قلعہ کا یہ سب انتظام دیکھ کر اورنگ زیب کو پوشیدہ طور پر فوراً اطلاع دی کہ وہ قلعہ میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرے ورنہ جان کی خیر نہیں اور قلعہ کے سب اندرونی حالات سے بھی اس کو آگاہ کیا۔ اورنگ زیب نے یہ متوحش خبر سُن کر عیادت شاہجہاں کے عزم کو فسخ کیا اور روشن آرا کا وہ انتہا درجہ کا مشکور ہوا کہ اس نے اس کی جان ہلاکت سے بچائی۔ روشن آرا کی محبت اورنگ زیب کے دل میں اسی وقت سے متمکن ہوگئی اور وہ بھی خانہ جنگی کے زمانے تک قلعہ کے تمام حالات سے خفیہ طور پر اس کو آگاہ کرتی رہی۔ آخر اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نے اپنی چالاکیوں سے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اور تھوڑے دن میں افق سلطنت تمام تعاون کے گرد و غبار سے پاک صاف ہوگیا۔

عالمگیر کے تخت پر جلوہ گر ہوتے ہی روشن آرا کا اختر بخت چمکا۔ شاہی خاندان میں اب اس کی سب سے زیادہ عزت ہونے لگی اور پولٹیکل امور میں بادشاہ اس سے مشورہ طلب کرنے لگا۔ اب وہی رتبہ جو جہاں آرا کو عہد شاہجہاں میں تھا روشن آرا کو حاصل ہوگیا

اس کی جاگیر میں بھی بہت اضافہ کیا گیا۔ ارکان سلطنت اس کے دردولت پر نذریں پیش کش کرنے کے لئے حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کو گرانبہا خلعت عطا کرتی تھی۔

روشن آرا نے جہاں آرا بیگم کی طرح سے بہت جاہ و شوکت کے سامان کیے۔ اس کی سواری کا جلوس اس شان سے نکلتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں اس چشم دید واقعہ کی ان لفظوں میں تصویر کھینچتا ہے۔

چنانچہ آپ اپنے خیال کو کیسی ہی وسعت دیجئے مگر روشن آرا کی سواری سے زیادہ اعلیٰ درجہ کا تماشا قیاس میں نہ آئے گا۔ یہ بیگم پیگو کے نہایت عمدہ اور بڑے قدآور ہاتھی پر ایسے میگھ ڈنبر میں سوار ہوتی ہے جس کے سنہری اور لاجوردی رنگوں کی چمک قابلِ دید ہے۔ اس کے ہاتھی کے پیچھے چھ اور ہاتھی چلتے ہیں جن پر اس کے محل کی معزز عورتیں ہوتی ہیں اور ان کے میگھ ڈنبر بھی شان اور خوب صورتی میں روشن آرا کے میگھ ڈنبر جیسے بلکہ تقریباً ویسے ہی ہوتے ہیں۔ شاہزادی کے بڑے بڑے اور خاص خاص خواجہ سرا زرنگاری بھاری پوشاکیں پہنے ہوئے گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں اور ہاتھوں میں چھڑیاں

لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھی کے ارد گرد ایک سالہ کشمیری اور تاتاری عورتوں کا ہوتا ہے جو بنا ؤ اور سنگار کئے ہوئے خوب صورت اور بادپا گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں اُن کے علاوہ اور بہت سے خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں جن کے ساتھ بڑی بھیڑ پیادل ملازموں کی ہوتی ہے جو ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لئے ہوئے شاہزادی کی سواری کے دائیں بائیں بہت دور آگے آگے سامنے کے لوگوں کو ہٹاتے چلتے ہیں کہ راستہ صاف رہے ساٹھ ستر ہاتھیوں کا تول تول کر قدم رکھنا اور میگھ ڈمبر کی چمک دمک اور نہایت خوش لباس اور بے شمار خدم و حشم کا انبوہ واقع میں دیکھنے والے کے دل پر شاہی شان و شوکت کا ایک عجب اثر ڈالتا ہے۔ میں ان سب دلفریب سامانوں کو فلسفیانہ بے اعتنائی کی نظر سے نہ دیکھتا تو بے شک میں بھی اُنھیں ہندوستانی کبیشروں کی مانند جو استعارے کے طور پر کہتے ہیں کہ "یہ شاہزادیاں نہیں بلکہ دیویاں ہیں جو ہاتھیوں پر میگھ ڈمبروں میں بیٹھی ہوئی خلائق کی نظروں سے پوشیدہ جا رہی ہیں" اپنی خیالات کی بلند پروازی کا مغلوب ہو جاتا۔ یہ حسین بیگمیں اپنے میگھ ڈمبروں میں یوں دکھائی دیتی ہیں گویا ہوا میں

پریاں اُڑی جارہی ہیں۔ ان بیگمات کی سواریوں کا تجمل اس قدر دلچسپ ہے کہ اس کی یاد سے اب بھی (فرانس میں) طبیعت کو ایک مسرت حاصل ہوتی ہے۔"

حاصل یہ کہ روشن آرا کا عروج ابتدائے سلطنت عالمگیر میں معراج کمال پر پہنچ گیا تھا لیکن مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے را زوالے" بہت جلد اس کو تنزل بھی ہو گیا۔

مورخین نے اس کی یہ وجہ لکھی ہے کہ عالمگیر تخت ہند پر بیٹھتے ہی کچھ دنوں بعد سخت علیل ہو گیا۔ اس موقع پر روشن آرا نے سب انتظامات سلطنت اپنے ذمے لے لئے اور تمام احکام اسی کے نام سے جاری ہونے لگے۔ اس نے شاہی مُہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور تمام فرامین پر وہی مُہر لگاتی تھی۔ اسی کے ساتھ اعیان سلطنت کو اس نے عیادت بادشاہ سے محروم رکھا۔ یہاں تک کہ بیگمات محل بھی عالمگیر کی حالت کو بچشم خود دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس زمانے میں اکیلی روشن آرا عالمگیر کی تیماردار تھی، اور اسی کے حکم کے مطابق عالمگیر کا علاج ہوتا تھا۔ اس بنا پر سخت بے چینی پھیلی اور تمام لوگ روشن آرا کی ان حرکتوں سے برافروختہ ہو گئے۔ روشن آرا نے اسی کے ساتھ یہ اور غضب کیا کہ جبکہ عالمگیر کی ایک ہندو بیگم نے جس پر عالمگیر دل و جان سے فریفتہ تھا بیٹا باز محل میں

داخل ہو کر شاہنشاہ کو خود دیکھنا چاہا تو روشن آرا نے اس کے نازک رخسارے پر ایسا سخت طمانچہ مارا کہ وہ تلملا گئی۔

کچھ دنوں کے بعد عالمگیر کو افاقہ ہوا تو اس نے روشن آرا کی یہ نازیبا حرکتیں سنیں اور اس کو ان باتوں سے ایسا رنج ہوا کہ روشن آرا کی اگلی وفاداری کے تمام کارناموں پر پانی پھر گیا اور وہ اس کی نظر سے اتر گئی۔ روشن آرا کو جو پہلے جاہ و فر حاصل تھا وہ بھی اب باقی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ محل کی عورتیں بھی اس کے سایہ سے بھاگنے لگیں کہ کہیں اس مرکز عتاب کے شمول میں وہ بھی معرض نقصان میں نہ پڑ جائیں ؎

کون ہوتا ہے بھلا وقتِ مصیبت کے شریک
کام جب دل پہ پڑا ساتھ جگر نے نہ دیا

لیکن اس پر بھی اورنگ زیب کا عتاب زیادہ تر دل ہی تک محدود رہا۔ اس نے روشن آرا کی جاگیر میں کسی طرح کی کمی و بیشی نہیں کی۔ نہ اس نے کسی اور طرح پر اپنے عتاب کا عملاً اظہار کیا۔ لیکن اس شاہی عتاب نے روشن آرا کے عیش و مسرت کو منغص کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان ایک بار وقعت کے معراج کمال پر پہنچ کر اپنے کو قعر ذلت میں دوبارہ دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔

روشن آرا نے یہ حالت دیکھ کر عالمگیر سے اجازت چاہی کہ

وہ شاہی محل سرا کو چھوڑ کر کہیں اور بود و باش کا انتظام کرے لیکن عالمگیر نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور اس کو دوسری جگہ رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اس عدم اجازت کی قوی وجہ یہ بھی کہ روشن آرا اس زمانے میں اورنگ زیب کی شاہزادیوں کی اتالیق تھی اور ان کو تعلیم دیتی تھی۔ عالمگیر نے سمجھا تھا کہ اس سے بہتر اتالیق شاہزادیوں کے لئے نہ مل سکے گی۔

اس بیگم نے بمقام دہلی انتقال کیا اور وہیں دفن بھی ہوئی۔

زیب النسا بیگم

سلاطین مغل کے خاندان میں زیب النسا بیگم نہایت فاضل اور دانش مند بیگم گذری ہے۔ اس کا نام بچہ بچہ کی ورد زبان ہے، اور تمام مورخین بھی اس کی قابلیتوں کے معترف ہیں۔ اس کی قابلیتیں اور پولیٹیکل کارنامے اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ ایک پردہ نشین عورت باوصف کمال پابندی پردہ کے بھی، فضل و کمال میں، نام و نمود حاصل کر سکتی ہے۔

زیب النساء بیگم، عالمگیر کی پیاری بیٹی تھی۔ یہ پانچویں فروری ۱۶۳۹ء کو پیدا ہوئی۔ اس کی چار اور بہنیں تھیں۔ لیکن جو دولت علم و فضل اس کو نصیب ہوئی نہ اس کی بہنوں کو تو کیا شاہی خاندان میں بھی سوائے ایک آدھ کے کسی کو حاصل نہ ہوئی۔

بادشاہ عالمگیر نے صغر سنی میں اس کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی۔ پہلے روشن آرا بیگم کے سپرد اس کی تعلیم ہوئی، تھوڑے ہی سے سن میں اس نے کلام مجید حفظ کر لیا۔ بادشاہ نے اس موقع پر ایک جشن نہایت دھوم دھام سے کیا جس میں تمام علماء و صلحائے زمانہ مدعو کئے گئے تھے اور سب بادشاہ کی سخاوت سے فیض یاب ہوئے زیب النساء بیگم کو بھی تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔

ختم قرآن کے بعد زیب النساء بیگم کو ملا جیون صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ جو ایک نامور مصنف تھے اور وہ عالمگیر کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ زیب النساء بیگم نے اُن سے تمام کتابیں پڑھیں، اس کے علاوہ زیب النساء کو خوشنویسی کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ پائے تخت کے مشہور خوشنویسوں سے اس نے مختلف قسم کے خط سیکھے نستعلیق، نسخ اور شکستہ میں اُسے کمال تھا۔ تمام ہم عصر اس کے خط کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور وہ اس درجہ سے نہیں کہ

بادشاہ وقت کی بیٹی کا خط ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بجائے خود کمال فن کا قطعی نمونہ تھا۔

زیب النسا بیگم کو انتہا درجہ کا علمی مذاق تھا اور بیگمات کی طرح آرام طلبی میں منہمک نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ علمی اشغال میں صرف کرتی تھی اور یہی چیزیں اس کے دل بہلاؤ کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں چنانچہ اس کے پاس ایک ایسا کتب خانہ تھا جس میں تمام علوم کی کتابیں جمع تھیں۔ جہاں اس کو کسی نادر کتب کا پتہ چلا اسے فوراً منگوالیا۔ اسی طرح پر اس کا کتب خانہ تمام نادر اور بیش بہا کتابوں کا مجموعہ تھا اور وہ اپنے عزیز اوقات کو اس چمن کی سیر میں گزارتی تھی۔ اس کے کتب خانے میں زیادہ تر مذہبی اور ادبی مذاق کی کتابیں تھیں۔

اس کے علاوہ زیب النسا بیگم اہل علم وکمال کی حد درجہ قدرداں تھی۔ چنانچہ اس کے ملازمین میں زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی تھی جو اس زمانے میں علم وفضل میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے سپرد علمی کام تھے۔ ان میں سے زیادہ تر شاعر مصنف اور خوشنویس تھے۔ علماء عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کرتے تھے۔ بعض کے سپرد ترجمہ کا کام تھا۔

ان کتابوں میں سے جو اس کے عہد میں ترجمہ ہوئیں ایک زیب التفاسیر

ہے جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ قرآن کی مشہور تفسیر کبیر کا ہے جو امام رازی کی نامور تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ ملا شفیع الدین عرض بیگی نے کیا تھا۔ جن کو بیگم مذکور نے کشمیر میں اس کام پر مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ زیب النسار نے اور بہت سی کتابیں ترجمہ و تصنیف کرائیں تھیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی زیادہ تعداد آج صفحۂ عالم سے ناپید ہے۔

زیب النسار بہت بڑی سخن سنج اور سخن فہم تھی۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں اسے ید طولےٰ حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی سے زبانِ شعر میں اس سے سوال و جواب ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کے اکثر شعر زباں زد خاص و عام ہیں۔ لیکن ہم کو اس کے ماننے میں کلام ہے۔ کیونکہ وہ اشعار اس قدر تہذیب و شائستگی سے دور ہیں کہ عقل ایک لمحہ کو باور نہیں کر سکتی کہ اتنی بڑی فاضل اور خدا پرست بیگم کے منہ سے ایسے لفظ نکلے ہوں گے اور نہ درایت یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ ایسے بادشاہ اجل کی بیٹی کو جس کے نام سے دل دہلتے تھے، ایک ادنےٰ آدمی نے ایسے الفاظ میں مخاطب کیا ہوگا۔

زیب النسار بیگم کا تخلص مخفی تھا۔ لوگ کہتے ہیں "دیوان مخفی" اسی کی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک ایرانی

استاد کا طبعزاد ہو لیکن ہمیں ایک غزل کا مقطع اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ شعر اضافہ کا نہ ہو تو ہم کو بھی اُسے زیب النسا کے کلام ماننے میں کچھ تامل نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

دختر شاہم ولیکن رو بہ فقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمیں نام من زیب النسا است

حاصل یہ کہ زیب النسا بہت بڑی سخن گو تھی، لیکن جو شعر اس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اُن کے زیب النسا کے طبعزاد ہونے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔

سلاطین مغل کی ملکی سیاست میں اکثر بیگمات نے بھی بہت کچھ حصّہ لیا ہے۔ مثلاً جہانگیر کے عہد میں نور جہاں بیگم نے روح رواں کا کام دیا شاہجہاں کی ابتدائی سلطنت میں ممتاز محل کا بہت کچھ اثر تھا۔ ممتاز محل نے جب وفات پائی تو اس کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم نے امور سلطنت میں بہت کچھ دخل دیا۔ زیادہ تر کام اسی کی رائے سے ہوتے تھے۔ جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو روشن آرا کا ستارہ چمکا۔ کیونکہ خانہ جنگی کے زمانے میں وہ عالمگیر کی طرفدار تھی اور قلعہ کی تمام خبریں خفیہ طور پر پہنچاتی تھی۔ اس وجہ سے عالمگیر اس کا بہت ممنون احسان تھا۔ اور اس کے ساتھ دلی محبت رکھتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام امور سیاست اسی کی رائے سے

انصرام پاتے تھے۔ فرامین کا نفاذ اُس کے حکم پر منحصر تھا لیکن اس کا یہ عروج زیادہ عرصے تک نہیں رہا جب زیب النسا بیگم کے علم و فضل اور روشن دماغی کا سکہ تمام دلوں پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ بھی اس سے زیادہ محبت کرنے لگا۔

اسی زمانے میں ایک اور حادثہ وقوع میں آیا جو روشن آرا کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ۱۰۷۴ھ میں عالمگیر سخت علیل ہو گیا۔ ہفتہ اُس پر غشی طاری رہتی تھی۔ روشن آرا اس کی تیماردار تھی، اور کسی متنفس کو اس مکان میں جہاں عالمگیر تھا وہ جانے نہیں دیتی تھی۔ مکان کے باہر قلمانیوں کا سخت پہرہ رہتا تھا۔ بادشاہ کی حالت مزاج سے کسی شخص کو آگاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

روشن آرا اس کوشش میں تھی کہ عالمگیر اگر وفات پائے تو اس کی جگہ شاہ عالم اس کا بڑا بیٹا جو ایک رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور مستحق سلطنت بھی تھا، تخت نشین نہ ہو بلکہ اس کے چھوٹے بھائی کو تخت ملے لیکن اس کی عمر اس وقت صرف چھ سال تھی۔ اس کے لئے اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کے جوان ہونے تک میرے ہاتھ میں عنانِ سلطنت رہے گی اس غرض سے اُس نے شاہی مہر بھی عالمگیر کے ہاتھ سے نکال لی تھی اور تمام فرامین اس زمانے میں اعظم شاہ کے نام سے جاری ہونے لگے۔ تمام صوبہ داروں، راجاؤں اور عمالوں کو بھی اس مضمون کے خط اس نے

بھیج دیئے

محل سرا میں ہر ایک سخت اضطراب میں تھا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بادشاہ زندہ ہے یا انتقال کر گیا۔

آگرہ میں عام طور پر یہ چرچا تھا کہ عالمگیر اب بچ نہیں سکتا۔ اس کے بعد شاہجہاں جو قلعہ آگرہ میں قید تھا پھر سلطنت حاصل کرے گا۔ لیکن عالمگیر کا خوف اس قدر تھا کہ اس کے زمانۂ علالت میں بغاوت کے لئے ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکا۔

آخر خدا خدا کر کے عالمگیر کو افاقہ ہوا۔ اس نے اس خوشی میں دہلی میں ایک جشن نہایت دھوم دھام سے کیا۔ اس جلسے میں اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ تک کے لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ رعایا نے اپنے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بیٹھے دیکھ کر جو خوشی کی اس کی کوئی حد نہ تھی۔ بادشاہ کا روشن آرا کی ان حرکتوں کے باعث اس پر سخت قہر عتاب نازل ہوا۔

روشن آرا کا زوال زیب النساء کے عروج کا زینہ تھا۔ اب اس بیگم نے بہت کچھ اختیار حاصل کر لیا اور امورِ سلطنت میں بھی دخل دینے لگی۔ اہم معاملات میں بادشاہ اس سے استصواب رائے کرنے لگا۔ اس کے علم و فضل فہم و دانش نے اس کی وقعت اور اثر کو دوبالا کر دیا تھا۔ منوچی لکھتا ہے کہ "زیب النساء کی بہ حیثیت سلطنت مغلیہ کے

کے ایک روشن تر ستارہ ہونے کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس وقت اس کی عمر پچیس سال کی تھی۔ بادشاہ کو ہنوز شفائے کامل حاصل نہ ہوئی تھی۔ زیب النساء نے اسے سفر کشمیر کی صلاح دی لیکن دو امور بادشاہ کو اس ارادے میں سدِّ راہ تھے۔ اول یہ کہ موسم گرما کی حرارت اس کی تندرستی کے لئے شاید مضر ثابت ہو۔ دوسرے یہ کہ شاہجہاں اب تک زندہ تھا۔ عالمگیر کو خوف تھا کہ دار الخلافت چھوڑنے سے کہیں بغاوت کا ہنگامہ برپا نہ ہو۔ کیونکہ شاہجہاں کے اب تک بہت لوگ ہمدرد تھے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر عالمگیر کا ارادہ ہوا کہ بھائیوں اور بھتیجوں کی طرح باپ کی بھی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اس کے متعلق زیب النساء سے بھی اس نے مشورہ لیا۔

زیب النساء نے اس کی بہت زوروں کے ساتھ مخالفت کی اور بادشاہ کو اس گناہ عظیم کے ارتکاب سے بچایا اور یہ سمجھا دیا کہ وہ تو خود شیخ فانی ہیں۔ ۷۰ برس کی اُن کی عمر ہو گئی۔ تندرستی کا یہ حال ہے۔ اعلیٰ حضرت چند روز اور صبر کریں۔ اُن کے مرنے میں کچھ دیر نہیں ایسی حالت میں کیا ضرور ہے کہ اتنا بڑا گناہ عظیم اپنے سر لیں اور ملک میں بدنام ہوں۔

آخر تھوڑے دنوں کے بعد شاہجہاں کا انتقال ہو گیا۔ اور عالمگیر سے زیب النساء نے سفر کشمیر کی پھر تحریک کی۔ عالمگیر راضی ہو گیا۔ چھٹی دسمبر کو دہلی سے روانہ ہوا۔ برنیر لکھتا ہے کہ اس موقع پر بادشاہ کے ہمرکاب پینتیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ تھے۔ سترہ میں بھی تھیں زیب النساء نے ایک مرتبہ جہاں آرا کو شاہجہاں کے ساتھ نہایت دھوم دھام کے ساتھ سفر کشمیر کرتے دیکھا تھا۔ اور اسی وقت سے اس کی تمنا تھی کہ میں بھی اسی طرح پر سفر کروں۔ چنانچہ اس موقع پر اس نے تمام حوصلے نکالے۔ زیب النساء بیگم ایک بلند اور خوب صورت ہاتھی پر سوار تھی جس کا ہودج سونے کا بنا ہوا تھا اور اس میں بیش قیمت جواہر لگے ہوئے تھے۔ ہاتھی کے اردگرد دور تک قلمانیوں اور خواجہ سراؤں کی جماعت رہتی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اور بیگمات کے ہاتھی تھے۔ یہ منظر قابلِ دید تھا۔ زیب النساء نے اس سفر میں بہت زیادہ سخاوت اور دریادلی سے کام لیا تھا۔

زیب النساء کی شادی نہ ہو سکی سلاطین مغل کی اکثر لڑکیاں شادی سے محروم رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ شادی کے لئے اپنے مقابل کا آدمی چاہتے تھے۔ دوسرے اُن لوگوں سے بغاوت کا بھی کھٹکا لگا رہتا تھا۔

زیب النساء کی دامن عصمت پر بازاری گپوں نے بڑا دھبہ لگا رکھا ہے۔ بعض ملک کے کوتاہ اندیش، اس کی اشاعت کرتے پھرتے ہیں اور ان نقلوں سے مجلسوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ ان بے اصل واہیات کے سرچشمہ حضرات مورخین یورپ ہیں جن کو ایسے بے سروپا قصے گھڑنے میں خاص یدطولےٰ حاصل ہے۔ اور برنیر اور لورنیر اس گروہ کے پیشوا ہیں۔

زیب النساء نے ۱۷۰۱ء میں چھ سال اپنے والد بزرگوار سے پیشتر وفات پائی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لاہور میں دفن ہوئی۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ وہ باغ جو اس کا مدفن قرار دیا جاتا ہے بیشک اسی کا باغ ہے جس کو اس نے میا بائی اپنی انا کو ہبہ کر دیا تھا۔ اس میں نہ دفن نہیں ہوئی۔ سر سید مغفور لکھتے ہیں کہ وہ دہلی میں زینت المساجد میں مدفون ہوئی۔ لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے غالباً وہ مسجد اس کی بہن زینت النساء کی ہے، اور اس میں وہی دفن ہے۔

پنجاب کے بہترین مورخ اور ہندوستان کے سب سے بڑے انشاپرداز شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اس کی قبر بیرون دہلی میں تھی۔ میں نے اس کی قبر خود دیکھی تھی۔ اس کا کتبہ جس میں آیت فَادْخُلِي فِي جَنَّتِي بھی شامل تھی جس سے عالمگیر نے اس کا سن وفات نکالا تھا اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ افسوس کہ اس کے سینے پر اب

ریل جاتی ہے فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارْ

صاحب جی

عہد شاہجہاں بادشاہ میں جن امیروں کو عروج ہوا تھا ان میں نواب علی مردان خاں سب سے ممتاز ہیں۔ اس نامور امیر کی شان و شوکت اور جواں مردی و دانائی کی نظیر دی جاتی تھی۔ کشمیر اور پنجاب دونوں صوبوں کے حاکم تھے۔ گرمی کی بہار کشمیر میں۔ جاڑے کا لطف پنجاب میں حاصل تھا۔ امیر الامرا دربار شاہی سے خطاب ملا تھا۔ بلخ میں اُزبک بہادروں کے مقابلے میں اُن کی تلوار نے جواں مردی کے جوہر دکھلائے تھے۔ اپنے ولی نعمت شاہجہاں بادشاہ کی ایک بار دعوت کی تو نسو قابیں مع سرپوش سونے کی اور تین سو قابیں مع سرپوش چاندی کی نعمت خانہ میں لگائی گئیں۔ دار السلطنت لاہور میں دریائے راوی سے نہر لاکر چشمہ فیض جاری کیا تھا۔ یہ وہی نہر ہے جس کے کنارے مشہور شالامار باغ خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ چند اونچے نیچے ٹیلے تھے جن کو کاریگروں نے

بہار نظر بنا دیا۔ اسی نامور امیر کی بیٹی وہ بیگم تھی جس کے حیرت انگیز کارنامے آج ہم سناتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زمانے میں بہت سی بیگمات ایسی گذری ہیں جن کے نام قابلیت کے جوہر آج تک روشن کر رہے ہیں۔ مثلاً بادشاہ بیگم نور جہاں۔ شہزادی جہاں آرا بیگم۔ زیب النسا بیگم وغیرہ وغیرہ

یہ بیگمات علم و ادب سلیقہ و تمیز میں ایسی ممتاز تھیں کہ اب تک ہماری سوسائٹی اُن کے ہنر کی اور ہمارا لٹریچر اُن کی تصنیفات کا ممنون ہے۔ لیکن ہماری ہیرو کے کارنامے اُن سے مختلف ہیں۔ اس کی لیاقت کے جوہر ملک داری اور جنگ کے میدان میں چمکے ہیں۔ کابل کا صوبہ پہاڑوں کی کثرت اور پٹھانوں کی جرأت کے سبب ہمیشہ سرکش اور خودسر رہا ہے۔ تیموریہ سلاطین کے زمانے میں وہاں بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں بادشاہی فوج کو غلبہ ہوا تو دب گئے۔ جب موقع ملا پھر بگڑ بیٹھے۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں بھی وہاں شورش کا زور شور تھا ایمل خاں افغان نے بادشاہی کا خطاب لے کر سکہ اپنے نام کا جاری کر رکھا تھا۔ بہت سی ناکامیابی کے بعد کابل کی حکومت امیر خاں میر میران کے سپرد ہوئی۔ اس امیر میں بہادری و تدبر دونوں جمع تھیں اُس نے تلوار کے زور سے سرکشوں کو قابو میں کیا اس کے بعد تالیف قلوب

کے ذریعے سے ان کے دل ہاتھ میں لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شورش برطرف ہو گئی۔ اور ہر طرف امن وامان کی برکت نظر آنے لگی۔ بائیس برس میر میراں با جاہ و جلال اس صوبے پر فرماں روا رہا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ سر اٹھا یا پاؤں نکالتا۔ امیر الامرا علی مردان کی بیٹی جن کا لقب صاحب جی تھا۔ امیر خاں میر میراں کی بیگم تھیں۔ اس بیگم کو جو تدبیر اور اولوالعزمی عالی جاہ باپ سے ترکہ میں ملی تھی اس میں والا مرتبہ شوہر کی ہم نشینی سے زیادہ ترقی اور قوت حاصل ہو گئی تھی صوبہ کابل کے بند وبست اور انتظام میں اپنے شوہر کی شریک اور مشیر رہتی تھی اور بہت سے عمدہ کام اس کی معاملہ فہمی اور تدبیر کی وجہ سے انجام پذیر ہوتے تھے۔

عالمگیر بادشاہ ایک روز شب کو تخلیہ میں صوبوں کی رپورٹیں ملاحظہ فرما رہے تھے۔ صوبہ کابل کی رپورٹ جو پڑھی تو اس میں نواب امیر خاں کی وفات کی خبر درج تھی۔ بادشاہ کو سخت تردد ہوا اور فوراً نواب ارشد خاں کو جو مدت تک کابل میں دیوان رہے تھے اور وہاں کی حالت سے خوب واقف تھے، یاد فرما کر ارشاد کیا "امیر خاں نے انتقال کیا۔ ایسے سرکش ملک کا بے سر رہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ اندیشہ ہے کہ دوسرے صوبہ دار کے پہنچنے تک وہاں بغاوت نہ پھیل جاوے"۔

ارشد خاں نے جرأت کر کے عرض کی کہ پیر و مرشد امیر خاں زندہ

ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مرگئے۔ بادشاہ نے کہا کہ کابل کی رپورٹ
ابھی ملاحظہ ہوئی ہے۔ ارشد خاں نے کہا کہ پیر و مرشد نے بجا ارشاد
فرمایا لیکن افغانستان کا انتظام صاحب جی کی تدبیر و دانشمندی
کے دامن سے وابستہ ہے جب تک وہ وہاں ہیں بد انتظامی ناممکن
ہے۔ فوراً اس مدبرۂ روزگار کے نام فرمانِ شاہی صادر ہوا کہ جب
تک شاہزادۂ شاہ عالم وہاں پہنچیں۔ افغانستان کو قابو میں رکھو۔
صاحب جی کو جو مشکل مرحلے پیش آئے ان کا بیان دشوار
ہے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اس خطرناک کوہستان میں سے
لشکر سلامت لے آیا بڑے جواں مردوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اس
قول کی تائید ہمارے زمانے کے معرکوں سے بھی ہوتی ہے۔

الغرض سب سے اوّل مرحلہ صاحب جی کو یہی پیش آیا کہ
لشکر کا انتظام قائم رکھنا اور سلامتی سے کوہستان طے کر کے میدان
میں پہنچنا تھا اور اس کی باتدبیر بیگم نے وہ تدبیر سوچی کہ ذرا بھی بدنظمی
نہیں ہوئی۔ امیر خاں کی وفات کا حال پوشیدہ رکھا۔ امیر خاں
کا لباس ایک ہم شکل شخص کو پہنا کر اور آئینہ دار پالکی میں بٹھا کر فوج
کا کوچ جاری رکھا۔ افسر و سپاہی یہ سمجھتے کہ ان کا سردار زندہ ہے
چنانچہ ہر روز صبح کو حسب قاعدہ پالکی کے سامنے آکر مجرا کرتے تھے۔

جب فوج کوہستان کو ہٹے کرآئی تو صاحب جی نے صورت حال سے پردہ اُٹھا دیا اور وفات امیر خاں کا اعلان کر کے سوگ میں بیٹھیں۔ یہ خبر سن کر کثرت سے افغانستان کے سردار تعزیت کو آئے۔ تعزیت کے پردے میں غالباً یہ بھی مطلب ہوگا کہ لشکر کی حالت جانچ کر فیصلہ کریں کہ اب ان کو کیا کرنا چاہیے اطاعت یا بغاوت۔ صاحب جی نے سب کو نہایت عزت اور تپاک سے لیا اور ٹھہرایا۔ فاتحہ کے بعد اس نے کہلا بھیجا کہ اگر بادشاہ کی فرماں برداری کرو گے تو جو تمہارا وظیفہ مقرر ہے وہ بدستور جاری رہے گا، اور اگر سرکشی کا حوصلہ ہے تو بسم اللہ آؤ اسی میدان میں فیصلہ ہو جائے۔ اگر میں عورت ذات غالب آ گئی تو قیامت تک نام روشن رہے گا۔ افغانی سردار جانتے تھے کہ یہ الفاظ کسی معمولی پردہ نشین بیگم کے نہیں ہیں۔ صاحب جی کی زبان سے نکلے ہیں۔ سب نے سر جھکا دیا اور اطاعت و فرماں برداری کا از سر نو عہد کر کے اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ شاہ عالم کے کابل پہنچنے میں عرصہ لگا اور اس مدت میں صاحب جی نے بندوبست و انتظام پوری قوت سے جاری رکھا

دو برس کامل کابل کا انتظام کر کے یہ بانیٔ عصمت آئیں بمقام برہانپور حد بارشاہی میں پہنچی اور بادشاہ مجازی سے اجازت

ے کر خداوند حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے واسطے سفر حجاز اختیار کیا۔ ملک عرب میں بھی اس کے فیض و سخاوت نے اپنے جوہر دکھلائے اور شریف مکہ وغیرہ عمائد نے نہایت اعزاز و توقیر سے ان کا استقبال کیا۔ صاحب جی کی کوئی اولاد نہ تھی، اپنے شوہر کے بچوں کو مثل اپنی اولاد کے پالا تھا۔

جب برہان پور میں بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئیں تو اس امانت کو دربار کے سپرد کیا۔ ان لڑکوں میں کئی نامور عہدوں پر ممتاز ہوئے

ایک بار صاحب جی کی پالکی ایک کوچے سے گذر رہی تھی کہ ناگاہ ایک مست بادشاہی ہاتھی سامنے سے آگیا۔ بیگم کے چوبداروں نے ہر چند فیل بان کو آواز دی کہ ہاتھی ہٹاؤ۔ مگر بہادت شاہی ملازمت کے نشے میں تھا ایک نہ سنی اور ہاتھی کو بڑھائے آیا جب قریب آگیا تو بیگم کے آدمیوں نے سونڈ میں تیر مارے۔ ہاتھی ان لکڑیوں کو کیا خطرہ میں لاتا، جھپٹ کر پالکی پر سونڈ ڈالی۔ کہاروں نے خوف زدہ ہوکر پالکی زمین پر پٹک دی اور اک طرف کو بھاگ گئے۔ بہادر بیگم کے حواس اب بھی قائم تھے۔ جونہی ہاتھی کی سونڈ پالکی پر آئی جست کرکے ایک صراف کی دکان میں جو قریب تھی ہو رہی اور کوٹھری میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ اس زمانے کی غیرت بھی عجیب تھی امیر خان

اس پر بگڑ گئے کہ کیوں پردے کے باہر نکلی۔ کچھ عرصے تک کھنچے رہے آخر رعیت نواز بادشاہ نے یہ سمجھا کر باہم مصالحت کرادی کہ بیگم نے اپنا پردہ اور تمہارا ناموس قائم رکھا۔ اگر ہاتھی سونڈ میں لپیٹ کر اچھال دیتا تو کیا ہوتا۔



زوجہ داؤد خاں پنی

ہندوستان نے اپنی زنانہ بہادری، شوہر پرستی اور وفا شعاری کے عنوان میں جو مثالیں قائم کی ہیں وہ انگلستان بلکہ یورپ بھر سے کسی طرح گھٹی ہوئی نہیں۔ بلکہ اگر انصاف کی عینک لگا کر دیکھیں تو یہاں کی جانباز زنانہ دلیریاں کچھ عجب خاموش اور تلوار سے زیادہ کارگر ہونے والے اثر سے بھری ہوئی ہیں۔ بلاشبہ کوئن الینر کا چپ چاپ زہر چوس کر اپنے خاوند کی ناگہانی موت کے منہ میں اپنے آپ کو دے دینا جان پر کھیل جانے کا انتہائیہ ایکٹ ہے۔ جون آف آرک فرانس کی کنواری کا متعدد نبرد آزمائیاں کرکے اپنے وطن کو انگلستان کے پنجے سے نجات دلانا مہتم بالشان تاریخی واقعہ ہے۔ لیڈی نتھس ڈیل کا

بھیس بدل کر شاہی قید خانے سے اپنے خاوند کو چھڑا کر نکال لانا بہت بڑی چالاکی اور شہزادی مٹیلڈا کا بادشاہ سٹیون کو اپنی حق یابی کے لیے برسوں چین نہ لینے دینا، فرقہ نسواں کی علو ہمتی و جواں مردی وغیرہ کی اعلیٰ مثالیں ہیں جن پر یورپ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ لیکن ذیل میں جو واقعہ میں بیان کرنے والی ہوں اس نوعیت میں وہ بھی اپنا آپ ہی نظیر ہے۔

افسوس یہ ہے کہ زنانہ کارگزاریوں کو ہمارے مورخین نے بہت بے اعتنائی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس فرقہ کا کوئی فعل خواہ وہ اخلاقی ہو یا تمدنی علمی ہو یا ملکی، ہندوستان کیا تمام ایشیائی مورخین کے نزدیک چنداں قابل توجہ اور وقعت تھا ہی نہیں۔ اگر شاید کسی نے چلتے چلتے کچھ لکھ دیا تو وہ بالکل اوٹ پٹانگ اور ایسے ایجاز مخل کے ساتھ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ تاریخی فلسفہ سے کما حقہ واقف نہ تھے۔ گویا وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اس قسم کی مثالیں نسل انسانی پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عظیم الشان مردانہ کارگزاریوں نے دنیا میں تغیرات عظیم پیدا کیے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ نازک و کم زور عورتوں کے دل و دماغ یا دست و بازو سے جو کچھ ہو گزرا اس کا فوری اثر خنجر خوں ریز سے زیادہ گہرا اور جادو سے زیادہ زور دار ہے۔ بلکہ اگر اس کو زندہ جادو

کہیں زیادہ بجا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس گر کو اہل یورپ نے خوب پایا ہے۔ تاریخ کے زنانہ حصے سے انھوں نے یہاں تک اعتنا کیا ہے کہ اگر کوئی واقعہ جھوٹا یا مشتبہ بھی ہے اور زبان زد خلائق ہو گیا ہے تو اس کو بھی داخل تاریخ کرنے سے باز نہیں رہے ہیں۔ پھر وہ بھی اسی شد و مد، دلچسپی اور اثر دار لفظوں میں جیسے کہ کوئی سچا واقعہ لکھتے ہیں۔

مثلاً کوئن ایلن کے زہر چوسنے کا قصہ بالکل فرضی اور بے بنیاد ہے مگر چونکہ طبیعت میں مہر و وفا ثابت قدمی و استقلال کے پیدا کرنے یا چمکانے کا ایک اچھا منتر ہے۔ اس لئے اس کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پھر بیان میں وہی زور شور جس سے خواہ مخواہ ایک عمدہ اشتعال پیدا ہو۔ واہ رے اہل یورپ! فلسفۂ تاریخ کے اس باریک اور نازک نکتہ پر پہنچ کر اس سے وہ فوائد حاصل کئے جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کی عورتیں اور بچے تک ہمارے مردوں سے زیادہ دلیر، ذہین، کارگزار اور زندہ دل ہیں۔ برخلاف اس کے ایک ہمارے مورخین ہیں کہ چاہے عورت کیسے سے کیسا ہی مردانہ اور غیر معمولی کام کر گزرے نہ اس کے نام سے غرض، نہ اس سے مطلب کہ وہ کب پیدا ہوئی اور کب مری، اور دوسری باتیں تو درکنار گویا ایک عورت ہونا اس کی ہزار خطاؤں کی ایک خطا ہے جس کی سزا میں اسے گمنام

ہی رہنا چاہیے! افسوس

میرا نشاں جو کوچۂ قاتل میں ڈھونڈھیے
اک مشت خاک وہ بھی اُڑائی ہوئی سی ہے

جس واقعہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ ایک فرخ سیری سردار داؤد خاں کی بیوی کا ہے۔ جب فرخ سیر اور اس کے سپہ سالار اور امیرالامرا حسین علی خاں میں کھٹ پٹ ہوئی اور حسین علی خاں کی خیرہ سری اور جا و بیجا دبانے بادشاہ کا ناک میں دم کیا تو بادشاہ نے اس کو داؤد خاں پنی صوبہ احمد آباد گجرات کے مقابلے کے لیے بھیجا کہ کہیں اسی بہانہ قصہ پاک ہو جائے اس بلائے بے درماں سے پیچھا چھوٹے۔

داؤد خاں قوم کا افغان اور دلیری و جانبازی میں سلطنت کے چیدہ سرداروں میں سے تھا۔ جب حسین علی خاں نے ایک بڑے لشکر کی سرکردگی میں داؤد خاں پر فوج کشی کی۔ اور قریب پہنچ کر کہلا بھیجا کہ حاضر ہو کر تجدید اطاعت کرے تو اس نے آنے سے انکار کیا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ کے اشارے سے ایسا کیا تھا۔ اس کی رفاقت میں بڑے بڑے جانباز سپاہی اور دلیرانِ وقت موجود تھے۔ چنانچہ دونوں طرف سے مقابلہ کی پوری تیاریاں ہونے لگیں۔

داؤد خاں کی بیوی ایک ہندو زمیندار کی بیٹی تھی جس سے اس

کی باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ یہ بیوی داؤد خاں کے عمدہ برتاؤ، شریفانہ سلوک اور خالص محبت کی وجہ سے مسلمان ہوگئی تھی، اور اس کے ساتھ ایسی ہی وفادار تھی جیسی کہ ایک بیاہتا بیوی ہونی چاہیئے داؤد خاں بھی اس کی عمدہ صفات کی وجہ سے اس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ جب تیار ہو کر حسین علی خاں کے مقابلے کے لئے چلا تو سب سے پہلے بیوی کے پاس رخصت ہونے کو آیا اور نہایت الفت و عظمت بھرے الفاظ میں اس سے میدان جنگ کی اجازت چاہی۔ بیوی نے آبدیدہ ہو کر کہا میرے لئے کیا حکم ہے"؟

داؤد خاں نے کہا کہ "پیاری بیوی! تم ایک معزز سردار کی بیٹی اور ایک بہادر سپاہی کی ننگ و ناموس کی مالک ہو کسی ہدایت کی تم کو ضرورت نہیں۔ تم خود اپنے اور اپنے خاوند کے درجے سے واقف ہو اور اس کی عزت و حرمت کے محفوظ رکھنے کے طریقے سے آگاہ ہو میں نے تم کو خدا کے اور اپنے شوہری حقوق کو تمہارے سپرد کیا داؤد خاں تو یہ کہہ کر بڑے اطمینان کے ساتھ میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوا، دانشمند اور دلیر بیوی نے اپنے محل سے میدان جنگ تک ہرکاروں کی ڈاک بٹھادی تاکہ دم دم کی خبریں اُسے پہنچتی رہیں اور لڑائی کے اتار چڑھاؤ کو وہ خود جانچ سکے۔

دونوں لشکروں میں مقابلہ شروع ہوا۔ افغانی سرداروں سے لیکر سپاہیوں تک نے مردانگی کا حق ادا کر دیا۔ کئی دفعہ امیر الامرائی جمعیت کے پرخچے اڑا دیئے۔ لیکن آخر میں حسین علی خاں کے لشکر کو غلبہ ہونا شروع ہو گیا۔ اب داؤد خاں خود مقابلے کے لئے نکلا۔ اس نے کئی بار کوشش کی حسین علی خاں کو قتل کر کے فرخ سیر کی مصیبت کا خاتمہ کر دے مگر خدا کی مرضی اس کے برعکس تھی۔ داؤد خاں کی بہادر بیوی محل میں بیٹھی بذریعہ خبرداروں کے یہ عارہی خبریں پا رہی تھی جس وقت تک افغانیوں کا پلہ بھاری رہا اسے چنداں فکر نہ ہوئی۔ مگر جب اس نے سنا کہ تمام چیدہ چیدہ افغانی سردار کام آچکے۔ اور اب خود داؤد خاں کی باری آگئی تو وہ خود اپنی تدبیر میں سرگرم ہو گئی۔

اس نے اپنی ایک خواص کو حکم دیا کہ میاں کی خلال پیش قبض چپکے سے میرے پاس لاکر رکھ دے۔ خواص کو حکم کی تعمیل بغیر چارہ نہ تھا۔ تمام محل پر ایک ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ سب کے سب اپنے آقا کے انجام کی فکر کے علاوہ اپنی بیوی کی تہورانہ دلیری کی وجہ سے دل ہی دل میں سہمے جلتے تھے۔ جانباز رانی کے تیوروں سے لونڈی، باندیاں، مامائیں، اصیلیں تاڑ چکی تھیں کہ ایسی ویسی خبر پاتے ہی ضرور جان پر کھیل جائے گی۔

یہ لوگ زیادہ تر اس وجہ سے اور بھی خائف تھے کہ داؤد خاں کی بیوی حاملہ تھی۔ میدان نبرد کی خبریں ہر آن چلی آتی تھیں۔ آخر ہرکارے نے خبر دی کہ داؤد خاں کا ہاتھی دشمنوں میں گھر گیا اور آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہادر بیوی فوراً اسانوٹی ہو گئی۔ اپنی خاص معتمد خواص کو اپنے پاس بُلا کر بٹھا لیا اور آخری فیصلہ کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئی چند لمحہ نہ گزرنے پائے تھے کہ حواس باختہ ہرکارے نے رو کر سنایا کہ افسوس دشمنوں نے ہماری اُمید کا اور تیر قضا نے داؤد خاں کا فیصلہ کر دیا۔

اس قیامت خیز خبر نے تمام محل میں کہرام مچا دیا۔ رانی نے جو اپنی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لوگوں کی گریہ وزاری اور شور و شیون میں ذرا شرکت نہ کی۔ بلکہ اُن کی مصروفیت کو غنیمت سمجھ کر اپنے انجام کی فکر میں لگ گئی۔ اس نے باوقار خاموشی، وفادارانہ مایوسی اور دانشمندانہ عجلت کے ساتھ اپنے خاوند کی اُس پیش قبض کو جو پہلے ہی سے مسند پر ڈالنے کے پاس رکھی تھی، اُٹھائی اور بغیر گھبراہٹ کے آہستہ سے اپنے پیٹ کو چاک کر لیا، اور سات ماہ کے بچے کو الگ سے جُدا کر کے اس خواص کو دیا جو قریب حاضر تھی۔ گویا منشا یہ تھا کہ اس بے ماں باپ کے بچے کی پرورش تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر اس کی عمر وفا کرے

تو داؤد خاں کی نشانی کیے مٹنے نہ دیتا۔ بچے کو سپرد کرنے کے بعد اسی پیش قبض سے رہا سہا کام تمام کر لیا۔ تمام محل میں دوہرا کہرام مچ گیا۔

تھوڑی دیر میں حسین علی خاں کے آدمی داؤد خاں کے......

دار الامارت پر قبضہ کرنے آئے تو سوائے حسرت و یاس کے اور کوئی منظر ان کو نظر نہ آیا۔ رانی کی اس سانحہ انگیز حرکت سے سب پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ کیا دوست کیا دشمن ہر ایک کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حسین علی خاں خود متاثر ہوا، اور ساری کیفیت لکھ کر دار الخلافہ دہلی کو روانہ کی۔ چند روز میں یہ زندہ جاوید کہانی تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔

سچ یہ ہے کہ جب تک تاریخ ہند کے صفحے دنیا میں باقی رہیں گے اس وقت تک زوجہ داؤد خاں کا نام شہیدانِ وفا عصمت مآب اور شوہر پرست بیویوں کی فہرست میں سنہری حرفوں کی طرح چمکتا رہے گا۔

بہو بیگم

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب دلی کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا اور فرخ سیر، محمد شاہ اور اُن کے جانشین بابر و اکبر کے نااہل وارث ثابت ہوئے۔ تو تیموری خاندان کی باکمال خواتین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور حرم سرائے قلعہ معلی کی وہ شاندار روایات قائم نہ رہ سکیں جو نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النسار کے قابل یادگار کارناموں کے ساتھ وابستہ تھیں۔

لیکن دلی کے بگڑنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ اور حیدر آباد میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں اور ان دونوں صوبوں نے دارالخلافہ کے تمدن کو بہت کچھ اخذ کیا۔ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری محمد شاہی دربار کا ایک طاقت ور رکن تھا، اسی نے فرمانروایانِ اودھ کے خاندان کی بنا ڈالی تھی۔ سعادت خاں کے بعد اس کا خواہر زادہ اور داماد ابوالمنصور خاں صفدر جنگ اودھ کا حاکم ہوا۔ دربار دہلی کی وزارت بھی صفدر جنگ کو اپنے خسر سے ترکہ میں ملی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب تک والیان اودھ برسرِ عروج رہے۔ نواب، وزیر

کہلاتے رہے اور جب اودھ کا انحطاط شروع ہو گیا تو انھوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ صفدر جنگ کی بیگم صدر النساء جو برہان الملک کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اودھ کی تاریخ میں نواب بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ بڑے دبدبہ کی عورت تھی۔ صفدر جنگ کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ سریر آرائے وزارت ہوا۔ شجاع الدولہ کی بیگم اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کے نام سے مشہور ہے۔

بہو بیگم کا بچپن لال قلعہ میں گزرا۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ بادشاہ اسے اپنی گود میں کھلایا کرتے تھے۔ مسلمان امرار اور والیان ملک میں یہ کمزوری ہمیشہ پائی گئی کہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے بعد فوراً عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ صفدر جنگ کی حرم سرا میں متعدد عورتیں تھیں۔ یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ شجاع الدولہ ایک جری اور معاملہ فہم شخص تھا لیکن اسی کے وقت میں دربار اودھ کی شرمناک روایات کا آغاز ہوا۔ باوجود کثرت ازدواج کے مسلمان رؤسا بالعموم منکوحہ بیگموں کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ شجاع الدولہ نے بھی بہو بیگم کے وقار اور احترام کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس کی حرم سرا کی کوئی عورت مال اور دولت، خدم و حشم کے اعتبار سے بہو بیگم کی ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ بیگم کو نواب کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ اس کے رسوخ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نواب

نے اپنی زندگی میں لاتعداد دولت اس کے حوالے کردی۔ بیگم کے رسوخ کا ایک بہت برا نتیجہ یہ ہوا کہ آصف الدولہ جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا غیر معمولی ناز و نعم میں پالا گیا اور نواب شجاع الدولہ کی حسب منشاء ولی عہد کی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی۔ شجاع الدولہ کے درباری بیگم کا نام "جناب عالیہ متعالیہ" کہے بغیر نہ لے سکتے۔ بیگم کے بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ دربار کے با اثر ارکین میں تھے۔ بیگم اپنے شوہر کی وفات کے بعد اکتالیس سال زندہ رہی اور اس نے اپنی زندگی تزک و احتشام کے ساتھ بسر کی۔ شجاع الدولہ کے وقت تک فیض آباد اودھ کا دارالحکومت رہا۔ آصف الدولہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد لکھنؤ میں قیام کرنا شروع کر دیا لیکن نواب بیگم اور بہو بیگم آخر تک فیض آباد میں رہیں۔

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے وقت (۱۷۷۵ء) علاوہ بے شمار زر نقد اور مال و متاع کے بیگم کے قبضے میں لکھنؤ سے مشرق و مغرب دونوں طرف نہایت وسیع اور سیر حاصل جاگیرات تھیں۔

بیگم نے آصف الدولہ کو اپنی آنکھوں میں پرورش کیا تھا، اسے اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن یہ امیدیں بہت جلد خاک میں مل گئیں۔ آصف الدولہ نے باپ کے مرتے ہی وحشیانہ

عیاشی شروع کر دی۔ اور ماں سے وہ پوشیدہ خزانے طلب کرنے شروع کر دئیے جو شجاع الدولہ بیگم کو دے گیا تھا۔ بیگم نے دو تین بار بیٹے کی درخواستیں منظور کر لیں۔ رفتہ رفتہ آپس میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور بیگم نے تہیہ کر لیا کہ آصف الدولہ کو اپنی دولت سے محروم کر دے۔

جب آصف الدولہ کو مایوسی ہوئی تو اُس نے انگریزی قوت کا سہارا تلاش کیا۔ وارن ہیسٹنگز اس زمانے میں روپے کی طلب میں سرگرداں تھا۔ بنارس کی شورش اسی سلسلے میں ہو چکی تھی۔ نواب نے قلعہ چنار میں وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کی اور انگریزی فوج کے جو اخراجات اودھ کے ذمہ واجب الادا تھے۔ اُن کی ادائگی کی یہ تدبیر بتائی کہ نواب بیگم اور بہو بیگم کے خزانوں سے اس قدر رقم وصول کر لی جائے نواب کا دعوےٰ تھا کہ ان دونوں بیگموں نے شجاع الدولہ کی دولت اور ریاست کے ایک حصے پر ناجائز تصرف حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ درحقیقت یہ تمام املاک وارث تخت و تاج کا حق ہیں۔ وارن ہیسٹنگز نے نواب کی رائے سے اتفاق کیا۔

نواب کے آدمی انگریزی سپاہ کے ساتھ بیگموں کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ خواجہ سراؤں نے کچھ تو اس وجہ سے کہ بیگموں کا روپیہ اُنھیں کے

کام آتا تھا اور کچھ حق نمک خواری ادا کرنے کے خیال سے کسی قدر مقابلہ کیا۔ لیکن مقابلہ بے سود تھا۔ عشرت لپسند خواجہ سراؤں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ انجام کار جس قدر روپیہ کی ضرورت تھی دونوں بیگموں کے معمور خزانوں سے وصول کرلیا گیا۔ اس جبر وتعدی کے سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بیگموں کی عزت وحرمت بالکل محفوظ رہی۔

آصف الدولہ کے بعد نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے۔ یمین الدولہ کے عہد میں انگریزی فوج کے اخراجات کا مسئلہ ازسرِ نو چھیڑا گیا۔ نواب نے بہو بیگم کی دولت اور جاگیر پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ بیگم نے سوتیلے بیٹے کی نیت بدلی ہوئی دیکھی تو سرکار انگریزی سے گفت وشنید شروع کی۔ صاحب رزیڈنٹ نے بیگم سے ایک وصیت نامہ لکھوایا جس کی رو سے سرکار انگریزی بیگم کے علاقے کی وارث قرار پائی۔ ابھی معاملہ ختم نہ ہوا تھا کہ نواب نے مجتہدین لکھنؤ سے وصیت نامہ کے عدم جواز کا فتوے حاصل کرلیا اور رزیڈنٹ کی غیر مکمل کارروائی فسخ ہوگئی۔

بیگم کے کار آزمودہ خواجہ سراؤں میں بہار علی خاں، شکوہ علی خاں، نسبت علی خاں ممتاز تھے۔ یہ لوگ محاصل وصول کرتے تھے اور جاگیرات میں سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ جواہر علی خاں

خواجہ سراجو "نواب ناظر" کے لقب سے ملقب تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات سے لے کر خود اپنی وفات تک بیگم کا معتمد علیہ کارندہ رہا۔ جواہر علی خاں ایک باہمت شخص تھا۔ وہ بیگم کی جائداد سے علماء و فضلاء کی قدردانی پر بھی خرچ کیا کرتا تھا۔

بہو بیگم کی سرکار میں جو باکمال جمع تھے۔ آصف الدولہ کے دربار کو کبھی نصیب نہ ہوئے۔ بہو بیگم کے متوسلین میں ایک شخص لچھمی نرائن نامی لاہور کا رہنے والا بڑا جید فاضل تھا۔ عربی و فارسی میں اُسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ فارسی میں غزل، قصیدہ، مثنوی تینوں صنفوں میں شعر کہتا تھا اور بہت اچھا کہتا تھا۔ افسوس کہ اس کی تصنیفات نایاب ہیں۔ مولوی محمد منیر کہ ان کی قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ عربی و فارسی زبانوں کی ادبیات میں ماہر تھے۔ تمام مشہور کتابیں اُن کو ازبر تھیں۔ اور ہر سوال کا جواب زبانی دیتے تھے۔

محمد فیض بخش مصنف "تاریخ فرح بخش" جس نے فیض آباد کے تذکرہ میں بیگم کے زمانۂ بیوگی کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔ محمد خلیل خوشنویس کہ تحریر کی ۱۸ طرزوں میں استاد تھا اور قدیم مکتوبات کی نقل اس خوبصورتی سے اتارتا تھا کہ اصل و نقل میں تمیز نہ ہو سکتی تھی مرزا محمد علی جو اس زمانے کا نہایت مشہور مُہرکن تھا۔

جب بیگم کے وسائل آمدنی میں کمی ہوئی تو نواب آصف الدولہ نے ان باکمالوں کو اپنے یہاں بلا لیا۔ لیکن جواہر علی خاں کی علم دوستی نے شیخ محمد خلیل اور منشی لچھمی نرائن کو آخر تک ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

بہو بیگم کی صحت بتدریج خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخرکار ۲۶ محرم سنہ ۱۲۳۰ھ (سنہ ۱۸۱۵ء) کو ۸۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مرنے سے کچھ مدت قبل اس نے گورنمنٹ انگریزی کے توسط سے اپنی جاگیرات اور مال منقولہ کا آخری تصفیہ کر دیا تھا۔ وفات کے بعد اس کی جاگیرات نواب غازی الدین حیدر (ابن نواب یمین الدولہ) کے حوالے کر دی گئیں۔ زر نقد گورنمنٹ انگریزی کے قبضہ میں آیا۔

بیگم نے اپنے دیرینہ ملازموں کے لیے جو وظیفے مقرر کر دیے تھے، وہ برابر اُن کو ملتے رہے۔ جواہر علی خاں کا انتقال بیگم کی وفات سے ایک سال پہلے ہو چکا تھا۔ دراب علی خاں نظارت میں جواہر علی خاں کا جانشین ہوا۔ اس نے بیگم کی تجہیز و تکفین کے مراسم بے نظیر شان و شوکت کے ساتھ ادا کیے۔

بیگم فیض آباد سے دو میل کے فاصلے پر جواہر باغ میں دفن ہوئی۔ دراب علی نے اپنی محسنہ بیگم کی وفات کے بعد نظارت سے استعفا دے دیا۔ اور اپنی فرصت کے اوقات کو بیگم کے عالی شان مقبرے کی

تیاری میں اور فاتحہ و عرس وغیرہ رسوم مذہبی کے ادا کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ بیگم نے اپنے وصیت نامہ میں ان اخراجات کے لئے رقم کثیر علیحدہ کر دی تھی۔

یہ بانصیب اور بااقبال بیگم عمر بھر زمانہ کی گردش سے مصون رہی۔ اس نے دلی کی شاہی حرم سرا میں پرورش پائی تھی، دولتِ مغلیہ کے جاہ و جلال میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر صفدر جنگ کی بہو اور شجاع الدولہ کی بیگم رہی۔ اودھ کے زرخیز صوبہ کی دولت اس کے قدموں پر نثار کی گئی۔

زمانۂ عروج میں اس کے پاس سوار و پیادہ دس ہزار فوج تھی اس کے فیل خانے اور اصطبل میں بے شمار ہاتھی اور گھوڑے رہتے اس کے زر و جواہر کے متعلق لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات تھے۔ جو لوگ براہِ راست یا بالواسطہ اس کی سرکار سے روزی حاصل کرتے تھے ان کی تعداد ایک لاکھ تک بیان کی گئی ہے۔ مشرقی مبالغہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اس تعداد سے بیگم کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بیگم کے ملازم نہایت خوش و خرم و آسودہ و مرفہ الحال رہتے تھے۔ اس کی سرکار کے ایک وظیفہ خور کا بیان ہے کہ "فرخ آباد

کے نوابان بنگش اس کے ادنٰے عہدہ داروں کی ہمسری نہ کر سکتے تھے اور اس زمانے میں کوئی ہندوستانی عورت اس قدر خوش حال اور معزز نہ تھی"۔

اپنے دیرینہ نمک خواروں کے ساتھ بیگم ہمیشہ نوازش اور کرم کا برتاؤ کرتی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ ہمیشہ مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب شجاع الدولہ کے تعلقات انگریز حکام کے ساتھ نہایت مخلصانہ تھے۔ علاوہ بریں بیگم آصف الدولہ یمین الدولہ اور غازی الدین حیدر، تینوں نوابوں سے کبیدہ خاطر رہی۔ وہ ایک اولوالعزم عورت تھی۔ اس کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص اس کی آزادی اور شان وشوکت میں خلل انداز ہو۔

اس کی دورانِ زندگی میں مغلیہ سلطنت بالکل تباہ ہوگئی اور انگریزی تسلط ہندوستان میں قائم ہوگیا۔ دو ایک مرتبہ انقلاب کی زد میں ضرور آئی لیکن اس نے کبھی برگشتہ بختی کا رنج نہ اٹھایا۔ اس نے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ کو آخر تک نباہ دیا۔ اس کی پر شوکت زندگی اسلامی حرم سراؤں کی دیرینہ عظمت کی ایک آخری یادگار تھی۔

قدسیہ بیگم

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کا عہد دولت و عیش و عشرت کے لئے ضرب المثل ہے۔ اس کے زمانے میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقہ تک کے لوگ مرفہ الحال تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ محاصل سلطنت کے چودہ کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کا ترکہ خزانے میں جمع تھا علاوہ بریں ملک اس زمانے میں قحط وغیرہ سے پاک تھا۔ اسی دولت اور مرفہ الحالی کی وجہ سے لکھنؤ اہل کمال اور متلاشیان روزگار کا مرکز بنا ہوا تھا اس وقت اکثر اہل یورپ و شاہزادگان دہلی لکھنؤ آتے تھے اور بادشاہ کی فیاضی سے فائز المرام ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ میں جو بڑے بڑے عالیشان محل ہیں وہ اسی عہد کے تعمیر کردہ ہیں۔ اگر تحقیق کرو کہ ان کے بانی کون تھے تو معلوم ہوگا کہ وہ ادنیٰ درجے کے لوگ تھے۔ اور اُن کی تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ مشکل سے آج کل دو تین آدمی اس میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کی فیاضی نے کچھ دنوں کے لئے اودھ میں غربت کو لفظ بے معنی بنا دیا تھا اور اس کے دریائے جود سے سب

چھوٹے بڑے سیراب تھے۔

بادشاہ نصیرالدین حیدر کی بیویوں کی تعداد تو کئی سو تک تھی لیکن وہ اپنی دو بیگموں سے بہت زیادہ محبت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے لکھنؤ کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا اور اس زمانے کے پالٹکس کی کشتی انھیں دونوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں بیگمات کا نام تاریخ اودھ میں قیامت تک باقی رہے گا۔ ان دونوں کے نام یہ ہیں، ملکہ زمانیہ بیگم دوسری نواب قدسیہ محل۔

نواب ملکہ زمانیہ کا عروج ابتدائے سلطنت نصیرالدین حیدر میں زیادہ تھا۔ جنرل سلیمن ریزیڈنٹ لکھنؤ اپنی کتاب میں (جو حقیقتاً باعث انتزاع اودھ ہوئی) اس بیگم کو اصلی فرماں روائے اودھ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ بیگم اصل میں ایک کرمی کی لڑکی تھی۔ ایک شخص فتح مراد نے اس کو اپنے قرضہ کی میں اس کے باپ سے عوض میں لیا تھا۔ فتح مراد کی بہن کرامت النسا نے اس کو اپنی بیٹی بنا کر پرورش کیا۔ جب وہ لاری (ملکہ زمانیہ کا پہلے یہی نام تھا) سن شباب کو پہنچی تو اس کی رستم خاں نامی ایک شخص سے شادی کر دی۔ ان دونوں نے آخر رستم نگر میں بود و باش اختیار کی۔ کیونکہ رستم خاں اس کا شوہر نواب مجیب خاں کے یہاں جو اس وقت ایک افسر فوج تھے ملازم تھا۔

اس زمانہ میں دولاری کے دو اولادہوئیں۔ ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد علی رکھا گیا اور دوسری بیٹی جس کا نام زینت النساء تھا۔

دولاری کی اس زمانے میں نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی آخر اس کے نصیب نے کروٹ بدلی اور نصیر الدین کے مشکیہ محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا وہی منا جان تھا جس کی تخت نشینی پر سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور وہ مدت العمر چنار گڑھ کے قلعہ میں بادشاہ بیگم کے ساتھ قید رہا۔ کچھ لوگ دایہ کی تلاش میں نکلے۔ خوش نصیبی نے ان کو دولاری کے گھر پہنچایا۔ جب دولاری محل سرائے شاہی میں داخل ہوئی، بادشاہ بیگم نے اس کو پسند کیا اور اطبا نے بھی اس کے دودھ کو مفید بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولاری ملازم ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی قدرتی خوبیوں نے بادشاہ کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا جس نے بادشاہ بیگم سے اجازت لے کر اس سے نکاح کرلیا۔ اور نواب ملکہ زمانیہ کے خطاب سے سربلند کیا

یہ بیگم بڑی عاقلہ اور دور اندیش تھی۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ کی قسمت اس کے ہاتھوں میں تھی۔ ہڑھ پروا کا کل علاقہ اس کو جاگیر میں ملا جس کی تحصیل چھ لاکھ روپے کی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے انعام و عطا کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کا بیٹا محمد علی کیواں جاہ کے خطاب سے سرفراز

ہوا۔ اور بادشاہ نے اس کے ولی عہد بنانے کی حتی الامکان بہت کوشش کی لیکن گورنمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ اس کی بیٹی زینت النساء کی شادی نواب ممتاز الدولہ سے ہوئی جس میں تیس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حکم دیا کہ سب عزیز و اقربا بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کر نذریں دیں۔ سب نے طوعاً و کرہاً حکم شاہی کی تعمیل کی لیکن نواب نصیر الدولہ (یعنی محمد علی شاہ) کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بادشاہ کا یہ حکم بجا نہ لا سکے۔ جب نصیر الدولہ تخت نشین ہوئے بیگم بقید حیات تھی۔ اس کو اپنی سمدھن قرار دیا۔ اور بہت مرتبہ اپنے یہاں بلایا۔ لیکن اس نے عذر علالت کر کے ہمیشہ بہانہ کر دیا۔

حاصل یہ کہ اس بیگم کا انتہا درجہ عروج ہوا۔ یہ قدرۃً بہت فیاض تھی سیکڑوں، ہزاروں آدمی کی اس کے ذریعے سے پرورش ہوتی تھی۔ اس کی سخاوت اور سیر چشمی لکھنؤ میں ضرب المثل ہو گئی۔ زندگی بھر وہ بادشاہ سے سمنی اولاد رہی۔ اس لئے ہر نوچندی کو درگاہ حضرت عباس جاتی تھی اور وہاں دس ہزار روپے صرف دسترخوان و نذر و نیاز میں صرف کرتی تھی۔

اس بیگم نے ۲۲ دسمبر ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں اس کا عالیشان امام باڑہ و مسجد اب تک موجود ہے۔

ملکہ زمانیہ کا یہ عروج بہت تھوڑے دنوں تک رہا، کیونکہ نواب قدسیہ بیگم کے آفتاب اقبال نے اس کے نصیب کی چمک کو ماند کر دیا۔ یہ بیگم بھی کوئی اعلیٰ خاندان سے نہ تھی۔ یہ نواب ملکہ زمانیہ کے یہاں اوّل اوّل بطور کنیز کے ملازم ہوئی تھی۔ اور فرائض پرستاری ادا کرتی تھی لیکن اس وقت ملکہ زمانیہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ کی خوشی و مسرت کی روح رواں بن جائے گی اور عزت کی اس قدر بلندی پر پہنچے گی کہ وہاں سے میرا مرتبہ بھی بہت چھوٹا نظر آئے گا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر سے اس کے تعلق کا دیباچہ یہ ہے کہ وہ ایک روز نواب ملکہ زمانیہ کے محل میں آئے۔ گرمی کا موسم تھا کچھ پیاس محسوس ہوئی اور آب حیات طلب کیا۔ اس وقت قدسیہ محل موجود تھی۔ فوراً زریں گلاس میں آب سرد حاضر کیا۔ بادشاہ نے پانی پی کر چند قطرے قدسیہ پر ڈال دیے۔ قدسیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بادشاہ کو اس بے باکانہ حرکت پر غصہ آگیا اور کہا کہ ہیں !! بادشاہ وقت سے یہ گستاخی !! اس نے فوراً جواب دیا کہ کھیل میں بادشاہی اور غریبی کا ذکر کیا؟ بادشاہ اس جواب معقول سے ساکت ہو گئے اور اس کی شوخی اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد سے جب اس محل میں جانے کا اتفاق ہوتا۔ اس سے ضرور

دو باتیں کرتے تھے۔ آخر کچھ زمانے کے بعد اس سے شادی کرلی۔

قدسیہ محل انتہا درجہ حسین اور بہت بڑی سخی تھی۔ بادشاہ نے بیس لاکھ روپے صرف اس کے زیورات وغیرہ کے لئے عطا کئے تھے۔ چھ لاکھ روپے کی جاگیر تھی۔ اس کو پڑھنے لکھنے سے بھی بہت شوق تھا۔ ایک مغلانی بیگم اس کی اتالیق تھی، جو بہت لیاقت رکھتی تھی۔ اور علمی تعلیم کے ساتھ اس کو امور خانہ داری اور کفایت شعاری وغیرہ کا بھی سبق دیتی تھی۔ حاصل یہ کہ یہ بیگم بڑی تعلیم یافتہ تھی قدرت نے فہم و فراست بھی اس کو بہت زیادہ ودیعت کی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پالٹکس میں بہت زیادہ دخل دیتی تھی۔ وزراء اور دیگر اعلیٰ سلطنت عہدہ داروں کا عزل اور نصب وغیرہ اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ سلطنت کے اہم امور میں اس کی رائے بہت زیادہ اثر رکھتی تھی۔ بادشاہ اس بیگم سے خاص محبت رکھتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے ایک روز بادشاہ سے کہا کہ میں نے تین لاکھ روپے نہیں دیکھے ہیں اس نے فوراً حکم دیا کہ مبلغ مذکور خزانۂ عامرہ سے لایا جائے۔ آخر اس حکم کی تعمیل ہوئی، اور تین لاکھ روپے کا ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس پر بیگم نے جلوس کیا بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ روپیہ غربا میں خیرات کر دیا جائے۔

اس بیگم کے مصارف بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ شاہانہ ساز و سامان

سے بسر کرتی تھی اور ہزاروں لاکھوں روپے ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں خرچ کر دیتی تھی۔ نواب ظفر الدولہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر وزیر اعظم معتمد الدولہ اور نواب قدسیہ بیگم کچھ اور جیتے تو سلطنت اودھ اُن کی فضول خرچیوں سے بک جاتی۔

قدسیہ بیگم بہت تند مزاج اور غصیل عورت تھی اگرچہ بادشاہ اور اس میں انتہا درجہ کی محبت تھی مگر کبھی کبھی لڑائی بھی ہو پڑتی تھی۔ آخر اس کا یہی غصہ و غضب باعث ہلاکت ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ اور قدسیہ محل بعد الفضلئے ایام چہلم تفریح طبع کی غرض سے کوٹھی دل کشا میں گئے ہوئے تھے۔ ایک روز بادشاہ بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے دیکھا کہ کچھ بندر درختوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر سے بندوق طلب کی۔ راجہ بختاور سنگھ بھی موجود تھا۔ اس نے بادشاہ کو اس حرکت سے منع کیا کہ بے وجہ کسی جان دار کو مارنا موجب نزول بلائے آسمانی ہوتا ہے۔ بادشاہ نے ہنس کر دو چار بندر شکار کئے اور محل سرائے میں چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی قدسیہ بیگم سے لڑائی ہو گئی اور بیگم نے کہا "انشاء اللہ یہ صورت صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی"۔ بادشاہ نے غصے میں جواب دیا کہ قول و فعل مختلف چیزیں ہیں۔ بیگم نہایت درجہ غیور اور تند مزاج تھی

پسی ہوئی سنکھیا ہیکل میں رکھی ہوئی تھی فوراً نوش جان کیا، اُس پر آب شورہ لیموں پی لیا اور چند دانے بھنے ہوئے بھٹے کے بھی کھا لئے تھوڑی دیر بعد خونی استفراغ ہوا جس میں چند لخت جگر بھی نکل آئے اسی کے ساتھ محل میں قیامت برپا ہو گئی۔ بادشاہ بھی دوڑے ہوئے محل میں آئے اور اشک حسرت و یاس برسانے لگے اور کہا کہ اے بالوئے باوفا آخر تُو نے اپنا کام تمام کیا۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں جو کچھ کہا تھا کرکے دکھایا۔ بادشاہ شدتِ غم سے وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکے، چکر والی کوٹھی میں جو لکھنؤ سے کچھ فاصلے پر واقع ہے چلے گئے۔

فوراً اطبائے حاذق جمع ہوئے اور علاج میں حتی الامکان بہت کوشش کی گئی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر بیگم نے چوبیس سال کی عمر میں ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔ اس خبر کے ساتھ شہر میں ہڑتال پڑ گئی۔ چالیس روز تک بادشاہ سے لے کر فقیر تک سیاہ پوش رہے ارکانِ دولت۔ اقربائے شاہی سب خاک بسر تھے۔ بہشت لکھنؤ ماتم سرا ہو گئی۔ رات کے وقت جنازہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اُٹھا اور کربلائے نو تعمیر مدفن بنایا گیا۔

بادشاہ بیگم کو بھی حد درجہ افسوس ہوا اور بوجہ کشش محبت

مادری بغیر سیاہ لباس کے بادشاہ کے پاس چلی آئیں اور بہت تسکین و تشفی دی اور کہا کہ خدا تجھ دولہ کو سلامت رکھے ایسی سو بیگم تجھ کو مل جائیں گی اس سے بادشاہ کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور کہا کہ اگر آپ کو کچھ غم ہوتا تو سیاہ پوش ہوتیں۔ بیگم نے جواب دیا کہ میں لباس سیاہ فقط عزاداری جناب سیدالشہدا علیہ السلام کو پہنتی ہوں۔ اور یہ کہہ کر چلی گئیں۔

حضرت کے عصے میں معدل ہو گئے

بادشاہ کے اب تمام ماتمی جذبات غصے سے مبدل ہو گئے اور بیگم کو حکم دیا کہ وہ فوراً محل سرا کو چھوڑ کر الماس باغ میں قیام کریں انھوں نے جواب دیا کہ یہ عطیہ میرے شوہر کا ہے میں خالی نہیں کر سکتی آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سپاہ بادشاہ پہنچی اور بیلداروں کے ذریعے سے محل کا کھدوانا شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین سے گولیاں چلنے لگیں اور دیر تک یہ طوفان بے تمیزی رہا۔ بیگم کی طرف کی حبشنیں اور لونڈیاں ماری گئیں، اور شاہی فوج میں بھی بہت جانیں ضائع ہوئیں اس خانہ جنگی نے بہت طول کھینچا۔ اس کی داستان بہت طویل ہے جس کی تفصیل ہم یہاں غیر مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے صرف یہ دکھانا تھا کہ بیگم کے انتقال کا کس قدر صدمہ تھا کہ ذرا سی بات میں اپنی مادر محترمہ سے لڑ پڑے۔ اور ان کو کیا کیا اذیتیں دیں۔

جنرل سلیمن اور سید محمد میر نے اس لڑائی کا جو منجر بہ ہلاکت بیگم ہوئی، سبب لکھا ہے، لیکن ہم کو اس کے یقین کرنے میں تامل ہے اس وجہ سے اس کی بحث یہاں قلم انداز کرتے ہیں حاصل یہ کہ اس سانحہ سے بادشاہ کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اکثر بیگم کے مدفن پر جایا کرتے تھے اور اس پر قطرۂ اشک کے پھول چڑھاتے تھے۔ کبھی ریزیڈنٹ صاحب بھی ساتھ ہوتے۔ لیکن وہ قبر سے دور کھڑے ہوتے تھے کئی مہینے تک بادشاہ کا یہی حال رہا اور امور سیاست کی مشین تو بالکل تباہ ہوگئی

اقربائے شاہی بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور سمجھے کہ جب تک اسی بیگم کی صورت اور سیرت میں مشابہ عورت نہ ملے گی بادشاہ کی حالت درست نہ ہوگی۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ اس کی بہن سے جو نواب دولہ کی بیوی تھیں طلاق دلوا کر بادشاہ کی شادی کردی جائے مگر وہ عورت بھی نور جہاں کی طرح بہت باوفا ثابت ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کی مفارقت قبول نہ کی۔ میر سید علی اس مہم عظیم پر بیڑہ اٹھا کر روانہ کانپور ہوئے۔ آخر بہزار جد و جہد نواب دولہ سے طلاق دلوا کر اس کو لکھنؤ لائے۔ لیکن جب بھی وہ راضی نہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد اُسے قید کیا لیکن بایں ہمہ تکلیفاتِ جسمانی و ترغیبات مالی اس کی وفا میں ذرا بھی تزلزل واقع نہ ہوا اور وہ زندان سے بھاگ کر

کانپور اپنے شوہر سے جا ملی (آفریں)

آخر بہزار کوشش بادشاہ کی نسبت شادی پختہ ہوئی اور رجب ۱۲۵۰ھ میں تاریخ عقد معین ہوئی۔ رسم حنا بندی ادا کی گئی۔ اس کے بعد محفل شاہانہ آراستہ ہوئی۔ تمام ارکان دولت، جنرل صاحب اور متعدد خواتین انگلشیہ شریک محفل ہوئیں۔ بزم کے گراں بہا سازو سامان سے آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں۔ روپیے کے مصارف کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جنرل لو نے بادشاہ کے فرق مبارک پر سونے کا سہرا باندھا بادشاہ نے ایک گلوری پان مغرق پلیٹ میں رکھ کر پیش کش کی اس شادی میں جو کچھ خرچ ہوا وہ بڑی بڑی ریاستوں کے محاصل کے برابر تھا جن بیگمات کے متعلق روپیے کی تقسیم تھی، ان کے ہاتھ کی سرخی حنا سیاہی سے بدل گئی تھی۔ ٹھاٹھر بندی کی روشنی نے رات کو دن سے زیادہ روشن بنا دیا تھا۔ پُرتکلف نقار خانہ قابل دید تھا، بعد رسم شادی بادشاہ مع عروس داخل دولت خانہ قدیم ہوئے، اور سلامی کی توپ چلی۔ عروس کو خطاب نواب بادشاہ جہاں ممتاز الدہر عنایت ہوا۔

اس شادی کے بعد بھی بادشاہ کی کچھ حالت متغیر نہ ہوئی کیونکہ ممتاز الدہر تو عروس سے ان کو نفرت ہو گئی۔ اس کی وجہ مورخین نے

یہ لکھی ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور سینتالیس بدریاں دوشالے درومال جامہ وار اور تھا نہائے لباس گرما بیگم کو عنایت کیا کہ وہ اپنے متوسلین وغیرہ میں تقسیم کر دے بیگم تو دلہن تھی یہ کام اس کی ماں کا تھا، لیکن اس نے اس میں دریغ کیا۔ بادشاہ نے ایک روز جب اس کے متعلق پوچھا تو بیگم نے جواب دیا کہ حضور ہم آپ کا گھر بنانے کو آئے ہیں نہ کہ بگاڑنے کو۔ اس پر بادشاہ کو بہت طیش آیا اور یہ کہہ کر کہ تو کنگلی ہے کسی کو کیا دے گی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیگم نے دامن پکڑا لیکن نہیں مانے اور باہر آ کر راجہ غالب جنگ سے کہا کہ ہم نے اس محل کو خطاب کنگلا محل کا دیا۔ چنانچہ آج تک وہ اس نام سے مشہور ہے۔ یہ تھیں شاہانِ اودھ کی فیاضیاں جس کی یہ ادنےٰ مثال ہے۔

اس کے بعد پھر بادشاہ نے نواب تاج محل سے شادی کی۔ اس کی جاگیر بہت بڑی تھی۔ اسی کے ساتھ چھ ہزار ماہوار بھی جیب خرچ کے ملتے تھے۔

ان بیگمات کا حال مسز پارک ایک سیاح لیڈی نے لکھا ہے جس کو بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر محل سرائے میں جانے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح لکھتی ہے۔

موجودہ بادشاہ کی بیگمات نہایت بیش بہا ملبوس پہنے ہوئے

گئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ الف لیلہ کی پریاں ہیں جو ان میں سے ایک تاج محل) اس قدر خوب صورت تھی کہ اپنے عروسی ملبوس میں وہ مجھے لالہ رخ کو یاد دلاتی تھی۔ میں نے ہندوستان اور یورپ میں کوئی ایسی خوب صورت عورت نہیں دیکھی۔ اس کے اعضا مناسب تھے اور ایسی آنکھیں اور پلکیں تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔ بادشاہ کی بڑی چاہتی بیگم ہے، اس کی شادی ہوئے ابھی ایک ماہ ہوا ہے۔ عمر بھی اس کی صرف چندہ سال کی ہے۔ یہ چھوٹی مخلوق ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے رکھتی ہے اور بہت زیادہ محجوب اور شرمیلی ہے۔ اس کی صورت اس قدر موہنی ہے کہ تم دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو جاؤ گے۔ اس کا لباس بالکل زریں اور قرمزی زربفت کا تھا اور اس کے بال بیش قیمت موتیوں سے گندھے ہوئے تھے جس کی لڑیں اس کے دوش پر لٹک رہی تھیں اور اُن کے اخیر میں ایک گوہر شاہوار رہتا تھا اور چارلس دوم کی طرح اس کے بال گھونگر والے تھے۔ اس کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ایک سونے کا زیور تھا جو لٹکا بھی تھا اور اس میں بڑے بڑے موتی اور گراں بہا جواہرات مثل زمرد وغیرہ کے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر

ایک بہشتی طرہ لگا ہوا تھا جس سے موتیوں کی لڑیں نکل کر سر کو
زینت کرتی تھیں۔ اس کے کانوں میں بھاری بھاری سونے کے
بالے پڑے ہوئے تھے جس میں بڑے بڑے موتی اور بیش قیمت
جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ناک میں بھی اس کے ایک نتھ تھی
جس میں جواہرات اور ایک گول اور بڑا گوہر شاہوار پڑا ہوا تھا
اور خوب صورت جسم پر ہار وغیرہ کی قسم سے اس قدر زیورات
تھے کہ وہ شمار میں نہیں آسکتے۔ اس کے کپڑے کی آستینیں بہت
بہت بڑی تھیں، لیکن کہنیوں کے پاس کھلی ہوئی تھیں۔ اس کا لباس
ایک بہت بڑا سایہ تھا جو گلے تک جا کے ختم ہوتا تھا اور نہایت
چست تھا۔ جب وہ چلتی تھی تو کئی عورتیں اس کے پاجامے کے
پائنچے اُٹھاتی چلتی تھیں اور کئی لونڈیاں اس کے پیچھے اس غرض
سے کھڑی رہتی تھیں کہ ان موتیوں کی لڑیوں کو درست کرتی
رہیں جو حرکت کے وقت اس کے زرلیفت اور تماشی بادلہ
کے دوپٹے میں الجھ جاتی ہیں۔ اس خاتون سے تمام بیگمات حسد
کرتی ہیں، ہم نے بادشاہ کی دوسری بیگم مخدرہ علیا کو بھی
دیکھا...... وہ تاج محل سے زیادہ حسین نہ تھی، لیکن
ہندوستانی عورتیں اسی کو زیادہ خوب صورت سمجھتی ہیں

اس کے سر پر ایک ہیرے کا تاج تھا جس میں جواہرات کی ایک کلغی لگی ہوئی تھی ۔ یہ ایک یورپین سوداگر کی لڑکی تھی جو بادشاہ کو انگریزی پڑھاتے تھے ۔ انگریزی فارسی اور ہندوستانی میں اس کو پوری مہارت حاصل تھی ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم پردے کے ساتھ زنانے میں رہنا پسند کرتی ہو ۔ اس نے سر ہلایا، لیکن بہت مغموم معلوم ہوتی تھی ۔ شاید یہ غم سوتوں کا تھا ۔ ہم اس کے بعد ملکہ زمانہ سے بھی ملنے گئے ۔ اس بیگم کا سلطنت میں بہت پولیٹیکل اثر ہے ۔ کیونکہ [redacted] ولی عہد کی ماں ہے ۔ اور کہتے ہیں کہ بادشاہ پر اس کا ایسا رعب داب ہے کہ وہ کبھی کبھی اس کو گوشمالی بھی دیتی ہے ۔



سکندر بیگم

ان کے والد نواب نظر محمد خاں تھے جو وزیر محمد خاں کے بیٹے تھے ۱۲۳۱ھ میں جب وہ بھوپال کے رئیس ہوئے تو انھوں نے نواب غوث محمد خاں کی بیٹی قدسیہ بیگم سے شادی کی۔ ۱۲۳۳ھ میں اُن کے بطن سے سکندر بیگم پیدا ہوئیں۔

ابھی یہ دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ان کے والد عین جوانی کے زمانے میں اتفاقیہ طور پر گولی سے ہلاک ہوگئے۔ مرتے وقت وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرے بعد قدسیہ بیگم ریاست کی مختار ہوں اور جب میری بیٹی سکندر بیگم بڑی ہو تو اخوان ریاست میں سے جس کے ساتھ اس کا عقد کیا جائے وہی رئیس ہو۔

سنہ ۱۲۵۱ھ میں جب وہ سترہ سال کی عمر کو پہنچیں تو اُن کے چچازاد بھائی نواب جہانگیر محمد خاں کے ساتھ ان کا عقد کیا گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد حسب قرارداد جہانگیر محمد خاں نے ریاست طلب کی۔

قدسیہ بیگم نے جو مختار ریاست تھیں نامعلوم وجوہ سے مخالفت کی۔ آخر اس معاملے نے طول کھینچا اور نوبت جدال و قتال تک پہنچی۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ نے درمیان میں پڑ کر جہانگیر محمد خاں کو ریاست دلوادی اور قدسیہ بیگم کے لیے اُن کی حین حیات تک کے واسطے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر الگ کرادی۔

گرچہ نواب جہانگیر محمد خاں کو ریاست مل گئی اور وہ مسند نشین ہو گئے۔ لیکن اُن کی طبیعت ان بیگمات سے رنجیدہ ہو گئی۔ روز بروز ناچاقی بڑھتی جاتی تھی۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخر مجبور ہو کر قدسیہ بیگم مع سکندر بیگم کے اسلام نگر کے قلعہ میں چلی گئیں اور وہیں انھوں نے رہنا شروع کیا۔

نواب جہانگیر محمد خاں ایک سپاہی منش اور فیاض آدمی تھے۔ تدبیر ملکی سے کم سروکار رکھتے تھے۔ اُن کے عہد میں انتظام میں ابتری رہی جس کی بدولت ریاست چند سال کے عرصے میں تقریباً بیس لاکھ روپے کی قرض دار ہو گئی۔

ابھی اُن کی جوانی ہی کی عمر تھی کہ وہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ سکندر بیگم ان کی عیادت کے لیے اسلام نگر سے آئیں اور دیکھ کر پھر وہیں لوٹ گئیں۔ آخر سنہ ۱۲۶۰ ھ میں جہانگیر محمد خاں انتقال کر گئے۔

ان کے مرنے کے بعد حسب تجویز نواب گورنر جنرل بہادر یہ طے پایا کہ نواب مرحوم کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال ہوں جس وقت وہ کتخدا ہوں گی تو ان کا شوہر رئیس ہوگا اور ان کی شادی کے زمانے تک کے لئے میاں فوجدار محمد خاں نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کے بھائی مختار ریاست قرار دئے گئے۔

خاں صاحب موصوف کے زمانے میں ریاست کا کاروبار اور بھی ابتر ہوگیا۔ خانہ جنگی اور شورش برپا ہوئی اور ریاست پر تقریباً چار لاکھ روپئے کے قرضے کا بار اور بڑھ گیا۔ بالآخر ۱۲۶۳ھ میں اُن سے استعفا لے کر سکندر بیگم صاحبہ کو نیابت کا خلعت عطا ہوا۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ نے جس وقت ریاست کی باگ ہاتھ میں لی ہے اس وقت اس کی حالت نہایت خراب تھی، نہ کچھ قواعد ضوابط تھے۔ نہ انتظام کا کوئی آئین و طریقہ تھا، نہ داد خواہی کے لئے عدالتیں تھیں۔ علاوہ بریں تقریباً چھبیس لاکھ روپے کا قرضہ تھا۔

جس کی وجہ سے اکثر زرخیز پرگنے ریاست کے سود خوار مہاجنوں کے قبضے میں تھے اور ریاست کی آمدنی صرف گیارہ لاکھ سالانہ رہ گئی تھی[1]

ارکان واعیان ریاست زیادہ تر بہادر اور جنگ جو لوگ تھے جو نہ انتظام وتدبیر ملکی سے اچھی طرح واقف تھے نہ قانون وضابطہ کی پابندی کو پسند کرتے تھے[2]

---

[1] سراج الاقبال تاریخ بھوپال میں مولانا عباس لکھتے ہیں کہ ریاست بھوپال کی کل آمدنی چالیس لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ لیکن تاج الاقبال تاریخ بھوپال میں جو خود وہاں کی رئیسہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی تصنیف ہے کل سالانہ آمدنی تقریباً ستائیس لاکھ لکھی ہے۔

[2] غدر سے پیشتر کا زمانہ جبکہ انگریزی تسلط اچھی طرح نہیں ہو چکا تھا۔ بدنظمی کی وجہ سے ہندوستان میں ایک قسم کی طوائف الملوکی کا زمانہ تھا بالخصوص وسط ہند میں مرہٹوں کی دست برد اور امیر خاں وغیرہ کے رستمانہ حملوں سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ خانانِ بھوپال جو ایک بہادر قبیلے کے فرزند ہیں ان شورشوں کی وجہ سے ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے۔ چنانچہ خان والا وزیر محمد خاں کی تمام عمر ہی جنگ وپیکار میں بسر ہوئی اور اطمینان سے نہ بیٹھ سکے۔

اس زمانہ کی ایک یادگار بھوپال میں اب تک موجود ہے یعنی گُھنگا کیونکہ بقیہ صفحہ ۳۰۷ پر

ایسی جماعت میں پرورش پاکر نواب سکندر بیگم صاحبہ کا محض اپنی کوشش سے ریاست کو ترقی دے کر باقاعدہ اور منظم بنا دینا ان کی بے نظیر قابلیت کی دلیل ہے۔

انگریزی پیمائش کی رو سے کل زمین ریاست بھوپال کی ۶۷۶۴ میل مربع ہے۔ سکندر بیگم صاحبہ نے تمام ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کرکے تین ضلعے اور تینوں ضلعوں میں ۲۱ پرگنے قائم کئے۔ ہر ہر ضلع میں ناظم اور ہر ہر پرگنہ میں تحصیل دار تھانہ دار عملہ وغیرہ متعین فرمائے۔ تمام ریاست کی جریب سے پیمائش کرائی۔ ہر گاؤں کی حد بندی کی، اور وصول تحصیل کے قوانین مرتب کئے۔ گذشتہ سالوں کے ناتمام اور

(بہ سلسلہ صفحہ ۳۰۶) ان لوگوں کو اکثر دور دراز مقامات تک دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لئے چھالیا اور کتھا کتر کے پاس رکھ لیتے۔ لڑائیوں اور حملوں میں بروقت ضرورت اسی کو منہ میں ڈال کر پیاس کو تسکین دیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ معرکوں سے واپس آکر جب ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جاتے تو یہی گٹکا بطور تواضع کے پیش کرتے۔ یہاں تک کہ اس کا عام رواج ہو گیا۔ اب بھوپالی کے رومال کے پلو میں گٹکے سے بھرا ہوا ایک بٹوا اور ایک ڈبیا میں چونا ضرور رہا کرتا ہے۔ چار ٹکے کی مزدوری کرنے والیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

پراگندہ حسابوں کو صاف کیا۔ مال کے لئے اصول اور ضابطے تیار کئے
دیوانی اور فوجداری کے قوانین کی الگ الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھائیں اور
ریاست کو ایک منظم اور مرتب قانون پر چلایا۔

ان کو خلائق کی آسائش اور رعایا کی بہبودی کا اس قدر خیال تھا
کہ اپنا عیش و آرام ترک کر کے تین چار بار تمام ریاست میں دورہ کیا۔ رعایا
کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اُن کی ضروریات کو سمجھا، اور ان
کا بندوبست کیا۔

وہ مثل مردوں کے فنون سپہ گری اور شہسواری میں طاق تھیں
گھوڑوں اور ہاتھیوں پر بیٹھ کر بے پردہ اور بے نقاب دورے کرتی
تھیں۔ ان کا رعب اور جلال ہی اُن کے لئے بہت بڑا پردہ تھا۔

اُن کی اس سرگرمی، تن دہی اور جانفشانی سے رعایا خوش حال
اور ریاست سرسبز ہو گئی۔ مالیہ میں ترقی ہوئی۔ سالانہ آمدنی گیارہ لاکھ
سے چوبیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ تمام قرضہ ادا کر دیا گیا، اور وہ محالات جو
بطور رہن کے مہاجنوں کے پاس تھے واگذاشت ہوئے۔

انھوں نے کمال فراست اور مردم شناسی سے اپنے لئے ایک
نہایت قابل مدبر اور خیر خواہ وزیر تلاش کیا یعنی مولوی جمال الدین خاں
صاحب جنھوں نے بیدار مغزی اور دیانت داری کے ساتھ ریاست کی

خدمت کی اور بیگم صاحبہ کے ارادوں اور اصلاحوں کی تکمیل میں سرگرم کوششیں انجام دیں۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ سیاق و سباق اور فارسی کی نہایت اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتی تھیں۔ خط کتنا ہی شکستہ کیوں نہ ہو بے تکلف پڑھ لیتی تھیں۔ پہلے ریاست کا دفتر بھی فارسی ہی زبان میں تھا جب گورنمنٹ نے ہندوستان کے دفاتر میں اردو جاری کی تو انھوں نے بھی ریاست کے دفتر کو اردو میں کر دیا۔

ریاست کے تمام پرگنوں میں رعایا کی تعلیم کے لئے اردو اور ہندی کے مدرسے جاری کئے۔ ۱۸۶۰ء میں خاص شہر میں مدرسہ سلیمانیہ اپنی چھوٹی نواسی سلیمان جہاں بیگم کے نام سے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم کے لئے کھولا۔ دستکاری اور صنعت و حرفت کے سکھانے کے واسطے ملکہ معظمہ انجہانی کے نام سے وکٹوریہ مدرسہ قائم کیا۔ اس زمانے میں مطبع کا بہت کم رواج تھا۔ لیکن انھوں نے ضروریات ریاست کے لئے ایک مطبع بھی جاری کیا۔

شہر بھوپال کی یہ حالت تھی کہ نہ وہاں سڑکیں تھیں نہ روشنی کا کوئی انتظام تھا۔ تنگ تنگ گلیاں تھیں جن میں چھکڑے بھی مشکل سے گذرتے تھے۔ انھوں نے نہایت فراخ اور وسیع سڑکیں بنوائیں ان

پر دو دو روپیہ لالٹینیں نصب کرائیں۔ ریاست کے صدر مقامات کو سڑکوں کے ذریعے سے ملحق کر دیا جس کی وجہ سے انتظام ملکی اور نیز اندرونی تجارت میں بہت آسانیاں ہو گئیں۔

پیشتر ریاست کی صورت یہ تھی کہ امرار کو جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے پاس سپاہیوں کو ملازم رکھتے تھے جو بروقت ضرورت ریاست کی خدمت انجام دیتے تھے۔

ان امیروں کی زیادہ تر یہ حالت ہوتی تھی کہ انتظام تدبیر سے کم اور سپہ گری و بہادری سے زیادہ ذوق رکھتے تھے۔ اس لئے جنگ و چپقلش پیدا ہونے کا اکثر خطرہ رہا کرتا تھا۔

بیگم صاحبہ نے اس طریقہ کو توڑ کر فوج کو تنخواہ دار ملازم قرار دیا اور ماہ بماہ ان کی تنخواہ ملنے کا بندوبست فرمایا۔ انگریزی اصول پر ان کو قواعد جنگ سکھانے کے لئے تربیت یافتہ دیسی افسر نوکر رکھے سواروں اور پیادوں کے لئے مختلف قسم کی وردیاں مقرر کیں، جس سے فوج باقاعدہ اور شائستہ ہو گئی۔

اسی طرح پولیس کا بھی نظام مرتب کیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے فرائض ادا کر سکے۔

الغرض وہ اپنے ان تمام کارہائے نمایاں کی وجہ سے تاریخ بھوپال میں

وہی رتبہ رکھتی ہیں جو تاریخ ہند میں اکبر اعظم کا ہے۔

خواجہ حالی تو فرماتے ہیں :۔

رُباعی

جس ملک کا کارخانہ دیکھو برہم — سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت — یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

مگر یہاں بیگم مالک دولت ہے اور مولوی جمال الدین خاں وزیر اعظم ہیں جن کے زہد و اتقا کے قصے اب تک مشہور ہیں، جو باوجود کاروبار ریاست کے ملانوں کی طرح مسجد میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اور پھر ملک کا کارخانہ ایسا اعلیٰ درجہ کا جس کی تمام دنیا تعریف کر رہی ہے، سبحان اللہ!! مصرعہ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

۱۸۵۷ء میں جب غدر ہوا تو جابجا فوجیں باغی ہو گئیں۔ گوالیار اندور جو بڑی بڑی ریاستیں ہیں اور بھاری بھاری فوجیں رکھتی ہیں وہ بھی اپنی اپنی فوجوں کو بغاوت سے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دانش مندی سے اپنی ریاست کی فوج اور نیز رعایا کو اس اثر سے محفوظ رکھا۔ چھاؤنی سیہور کی سپاہ نے جب بغاوت کی تو فوراً اس کی سرکوبی کے لئے بھوپال سے فوج بھیجی اور باغیوں کے ہاتھ سے چھاؤنی کو نہایت ہوشیاری سے بچا لیا۔

انھوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں اور ان کو ہر قسم کا آرام دیا۔ انگریزی فوج کے لئے کالپی کے حدود تک غلّہ اور رسد پہنچائی اور ساگر، جھانسی اور بندھیل کھنڈ تک اپنی فوج حفاظت اور امن قائم کرنے کے لئے بھیجی۔

ان کی اس وفاداری کی گورنمنٹ نے بہت قدردانی فرمائی۔ جنوری سنہ ۱۸۶۱ء میں بمقام جبل پور لارڈ کیننگ نے ایک دربار منعقد کیا جس میں وسط ہند کے رؤسا شریک تھے۔ اس دربار میں لارڈ صاحب ممدوح نے نواب سکندر بیگم صاحبہ کو خطاب کر کے ان کی بہت تعریف کی، اور ان کی غدر کی خدمات کا اعتراف کر کے بطور صلہ کے پرگنہ بیرسیہ کی سند تملیک جس میں ۲۵۴ مواضع ہیں اور جو ریاست دھار کے ملک کا حصہ تھا اور بوجہ بغاوت کے ضبط کر لیا گیا تھا اپنے دست خاص سے عطا فرمائی۔

سنہ ۱۲۷۲ھ میں بیگم صاحبہ کی درخواست کے مطابق گورنمنٹ نے اُن کی بیدار مغزی کے سبب سے خوشنودی کے ساتھ ان کو بھوپال کی مستقل رئیسہ کر دیا۔ اور وہ باقاعدہ سند نشین ہوئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم نے جو اپنے باپ کی وراثت کے لحاظ سے رئیسہ تسلیم کی جا چکی تھیں۔ کمال سعادت مندی سے ولی عہد رہنا منظور کیا۔

۱۸۶۱ء میں لارڈ کیننگ نے پھر بمقام الہ آباد دربار منعقد فرمایا۔ اس میں بیگم صاحبہ کو اسٹار آف انڈیا کا تمغہ اور خطاب عطا کیا گیا۔

دربار سے فارغ ہوکر بیگم صاحبہ بنارس، جونپور، فیض آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، متھرا وغیرہ کی سیر کرتی ہوئی دہلی تشریف لائیں۔ ان تمام مقامات میں گورنمنٹ کی طرف سے اُن کے اعزاز کا پورا لحاظ رکھا گیا۔

دہلی پہنچ کر شاہی عمارات دیکھیں اور متبرک مقامات کی زیارت کی۔ جامع مسجد، دہلی جو غدر کے بعد اس جرم پر بند کردی گئی تھی کہ مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا تھا، بیگم صاحبہ کی استدعا پر کھل گئی اور عام طور پر مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت ملی۔

دہلی سے جے پور تشریف لے گئیں۔ مہاراجہ صاحب جے پور نے شاہانہ مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا

بعد ازاں اجمیر میں آکر حضرت خواجہ کی زیارت کی۔ وہاں سے قطع مراحل کرتی ہوئی بھوپال پہنچیں، اور خطاب ملنے کی خوشی میں ایک شاندار دعوت کا جلسہ کیا۔

۱۸۶۳ء میں جب آگرہ میں دربار ہوا تو اس میں وفاداری اور حسن انتظام کے صلے میں ایک نہایت گراں بہا خلعت بیگم صاحبہ

کو عطا کیا گیا

نواب سکندر بیگم صاحبہ مذہب کی بڑی پابند تھیں۔ جب ریاست کے انتظام سے فارغ ہوئیں اور اس طرف سے اطمینان ہوا تو انھوں نے خیال کیا کہ میرے اوپر حج فرض ہے اس لئے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں ریل بھوپال سے بہت فاصلے پر تھی یعنی قریب برہان پور کے مقام ہرگاؤں میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ پھر سمندر کا سفر نہایت خطرناک، کیونکہ زیادہ تر بادبانی جہاز چلتے تھے، اور دخانی جہاز بھی اس قدر محفوظ نہ تھے جیسے کہ اب ہوتے ہیں۔

باوجود اس قدر سفر کی دشواریوں کے عالی ہمت بیگم نے فریضہ حج ادا کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔

۱۲۸۰ھ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا قافلہ ساتھ لے کر جن میں اُن کی والدہ قدسیہ بیگم اُن کے ماموں میاں فوجدار محمد خاں اور مدار المہام مولوی جمال الدین خاں صاحب بھی تھے۔ وہ بیت اللہ کو روانہ ہوئیں۔

دو جہاز بادبانی اور ایک دخانی کرایہ کر کے یہ قافلہ مکہ معظمہ پہنچا اور حج کے مناسک ادا کئے۔ بدوؤں کی شورش وغیرہ کی وجہ سے مدینہ

مدینہ منورہ نہ جاسکیں صرف حج کرکے واپس آگئیں۔ وہاں ان ماں بیٹیوں نے تقریباً چار لاکھ روپیہ مصارف خیر میں صرف کئے۔

بیگم صاحبہ نے سفرِ حج کا روزنامچہ بھی تفصیل کے ساتھ مرتب کیا لیڈی صاحبہ کرنل اسبورن صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال نے اس کو انگریزی میں ترجمہ کرکے چھپوایا ہے۔

۱۸۶۶ء میں آگرہ میں عالیشان دربار ہوا جس میں وسط ہند کے چوراسی والیان ملک شریک تھے۔ وائسرائے نے خصوصیت کے ساتھ نواب سکندر بیگم صاحبہ اور مہاراجہ سندھیا کے حُسن انتظام اور کارگزاری کی تعریف فرمائی اور دوسرے والیان ملک سے توقع ظاہر کی کہ وہ ان کی تقلید کریں گے۔

واپسی میں دہلی، فتح پور سیکری، متھرا، بھرت پور، دھولپور، گوالیار، دتیا، جھانسی وغیرہ مقامات کی سیر کرتی ہوئی بھوپال میں داخل ہوئیں۔

اس سیر و سفر کے تھوڑے عرصے کے بعد بیمار ہوئیں اور اکیاون سال کی عمر میں ۱۳ رجب المرجب ۱۲۸۵ء میں عالم بقا کو رحلت فرمائی باغ فرحت افزا میں جو انھیں کا تعمیر کردہ ہے دفن ہوئیں بحیثیت مختار ریاست و مستقل رئیسہ کے ۲۳ سال تک انھوں نے فرمانروائی کی۔

بیگم صاحبہ باوجود اس شان وجلالت کے نہایت سادہ مزاج اور پابندِ شرع تھیں۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری تجہیز و تدفین میں کوئی رسم خلاف شرع نہ کی جائے اور قبر پر گنبد ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا قبر پر صرف سنگ مرمر کا ایک تعویذ لگا دیا گیا ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا فرض رعایا کی بہبودی اور ترقی کو سمجھا تھا۔ وہ دن رات انھیں کی بہتری کے خیالات اور افکار میں منہمک رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے رعایا بھی ان پر قربان تھی اور وہ اپنی اس خیر خواہ فرماں روا کو بے حد عزیز رکھتی تھی۔ باوجود اس ہر دلعزیزی کے اُن کا رعب و جلال بھی بہت تھا۔

اُن کو مردم شناسی کا بڑا ملکہ تھا۔ اور وہ جوہر کی بڑی قدرداں تھیں۔ اسی وجہ سے ان کے عہد میں بھوپال میں جہاں علم و فن سے کم تر لوگ واقف تھے بعض بعض اچھے اچھے اہل علم و فضل آئے اور ان کی قدر کی گئی۔

سیر و سفر میں انھوں نے جو عمارتیں دیکھی تھیں ان میں سے دہلی کی جامع مسجد اُن کو بہت پسند آئی۔ بالکل اسی کے نمونے پر بھوپال میں موتی مسجد کی بنیاد ڈالی۔ تمام مسجد سنگ سرخ اور اندرونی حصّہ سنگ مرمر کا رکھا۔ اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ وہ انتقال کر گئیں۔ بعد میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے اس کو مکمل کرایا۔

شاہجہاں بیگم

ان کے والد جہانگیر محمد خاں تھے جس زمانے میں اُن کی والدہ سکندر بیگم نواب جہانگیر محمد خاں کی نا چاقی کی وجہ سے قلعہ اسلام نگر میں چلی گئی تھیں۔ اسی زمانے میں قلعہ مذکور میں ۲ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ میں اُن کی ولادت ہوئی۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد جب وہ بھوپال کی رئیسہ ہوئیں تو ان کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی۔ اُن کی تمام تر تعلیم و تربیت اُن کی والدہ سکندر بیگم کے زیر اہتمام ہوئی۔

انھوں نے اردو، فارسی، حساب وغیرہ میں اچھی لیاقت حاصل کی، اس کے علاوہ فنونِ سپہ گری مثلاً شہسواری، نیزہ بازی وغیرہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ وہ خود کہتی ہیں:

تا چراغ عقل در فانوس دل افروختم ... عجب و نخوت جملہ اسباب جہالت سوختم
شہسوارم نیزہ باز و تیر انداز و شگرف ... در شب تاریک اکثر پائے سوزن دوختم
از کرمہائے الٰہی در میان چند سال ... علم دین و نحو و صرف و ہندسہ آموختم

نظم و نثرم بر کمالاتم گواہ عادلست   منت ایزد را کہ گنج شائگان اندوختم

جب ان کی عمر ۱۹ سال کو پہنچی تو ان کی شادی ریاست کے سپہ سالار نواب امراؤ دولہ باقی محمد خاں کے ساتھ ہوئی۔

چونکہ نواب سکندر بیگم صاحبہ اس قانون سے کہ بیگم کا شوہر ریاست کا مستقل رئیس ہو بہت کچھ تلخیاں اور تکلیفیں اُٹھا چکی تھیں۔ اس لئے انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے سے پہلے ہی یہ معاملہ گورنمنٹ سے طے کر لیا کہ ریاست کی مستقل رئیسہ بلحاظ وراثت کے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ ہی رہیں اور اُن کا شوہر برائے نام نواب ہو

اس کی شادی کے کچھ دنوں بعد غدر ہوا جس میں نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دانش مندی سے ریاست کو اپنے قابو میں رکھا۔ اور اس کی حفاظت کی جس سے گورنمنٹ بہت خوش ہوئی۔ اس لئے بعد غدر کے ۱۲۷۶ھ میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے باوجود مستقل رئیسہ ہونے کے کمال سعادت مندی سے اپنی محترمہ، مدبرہ، اور منتظمہ والدہ ماجدہ کو ریاست کی حکومت سپرد کی اور خود اُن کے سایہ عاطفت میں دلی رہنا منظور کیا۔

سنہ ۱۲۷۴ھ میں اُن کی پہلی بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا موجودہ فرماں روائے ریاست بھوپال پیدا ہوئیں اور سنہ ۱۲۷۷ھ

میں دوسری بیٹی سلیمان جہاں بیگم صاحبہ کی ولادت ہوئی لیکن ابھی ان کی پانچ سال کی بھی عمر نہ ہوئی تھی کہ ۱۲۸۲ھ میں انتقال کر گئیں۔

۱۲۸۲ھ میں نواب امراؤ دولہ باقی محمد خان حج سے بیمار ہو کر واپس آئے اور قضا کر گئے اور اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نواب سکندر بیگم صاحبہ نے وفات پائی۔

ان پیاپے جانکاہ صدموں نے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی نگاہ میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیا۔ چنانچہ انھوں نے نہایت شکستہ دلی کے ساتھ فرمایا ہے

اے چرخ چہ کردی بسلیمان و سکندر
کز تو ہوس عیش نبود شاہجہاں را

نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ کی رسم عزاداری کے بعد دوبارہ ۱۲۸۵ھ میں وہ سریر آرائے ریاست ہوئیں۔

صدر نشینی کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ریاست کی انتظامی حالت بہت ابتر ہے۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ اپنی آخری زندگی میں چونکہ سفر حج وغیرہ اور بیماری کی وجہ سے کام نہ کر سکی تھیں اس وجہ سے حکم طلب کاغذات کے انبار دفتر میں جمع ہو گئے تھے۔ رعایا کے ہزاروں مقدمات ملتوی پڑے ہوئے تھے۔ خزانۂ ریاست پر سات لاکھ کے قرض

کا بار تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے نہایت تندہی اور جانفشانی سے نظم و نسق شروع کیا۔ حکم طلب کاغذات پر احکام لکھوا کر دفتر سے نکالا ساڑھے تیرہ ہزار غیر منفصل مقدمات کی مسلیں جو پڑی ہوئی تھیں اور جس سے رعایا سخت مشکل میں گرفتار تھی نہایت عمدگی سے تقسیم عمل کے اصول پر چھانٹ چھانٹ کر جن جن محکموں کے متعلق تھیں سپرد کی گئیں اور ان کے بہت جلد حسب ضابطہ فیصل کر دینے کی بابت احکامات صادر کیے گئے۔ جہاں جہاں عملہ ناکافی تھا وہاں وہاں اضافہ کیا اور ایک خاص محکمہ۔ محکمہ تحقیقات سنین ماضیہ کے نام سے قائم کیا جو اس بات کی دیکھ بھال رکھے، اور نیز امداد کرے کہ وہ مقدمات بہت جلد اور باقاعدہ طے کر دیئے جائیں۔ اس طرح پر وہ مقدمات منفصل ہو گئے۔ اور خوش اسلوبی کے ساتھ ریاست کا کاروبار چلنے لگا۔

قرضہ بھی تین چار سال کے اندر بیباق کر دیا اور ریاست اس بھاری بوجھ سے سبکدوش ہو گئی۔

انھوں نے بھی اپنی محترم والدہ کی طرح ریاست کے مختلف اوقات میں دورے کیے اور رعایا کی حالت سے واقفیت حاصل کرکے ان کی فرزندانہ کا بندوبست فرمایا۔ انتظام میں بہت کچھ اصلاحیں کیں جس سے رعایا

کو آرام ملا، اور سرکار انگریزی نے اس کی مدح و تعریف فرمائی
انھوں نے تمام ریاست کا کمپاسی پیمائش کی رو سے بندوبست کرایا
جس سے اس کے محاصل میں اضافہ ہوا اور رعایا کے ساتھ ہر طرح کی ممکن رعایتیں
برتیں کاشتکاروں اور ٹھیکہ داروں کو معافیاں دیں۔

انھوں نے قانون میں حسب ضرورت ترمیم کی اور از سرِ نو اس کو
نہایت عمدگی سے مرتب کرایا۔ عدالت کے لئے جو ڈیشل محکمے قائم کئے۔

فوجی معاملات کی طرف بھی انھوں نے توجہ فرمائی، چونکہ وہ خود
حوصلہ مند اور بہادر تھیں اس لئے فوج سے ان کو دلچسپی تھی۔

انھوں نے اپنے لئے باڈی گارڈ کا ایک رسالہ مرتب کیا جو ہر لحاظ
سے نہایت شاندار تھا۔ ریاست میں پہلے بیلوں کا توپ خانہ تھا۔ انھوں
نے اسپی توپ خانہ قائم کیا۔ سواروں کی حالت درست کی اور ان کی تنخواہ
میں اضافہ فرمایا۔ لاکھوں کے صرفہ سے رجمنٹ اعانت شاہی قائم کی۔

رفاہِ عام کے کاموں کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

انھوں نے مفصلات میں پختہ سڑکیں بنوائیں جو علاقہ جات غیر سے
جا کر مل گئی ہیں۔ جہاں پانی کی تکلیف تھی وہاں کنوئیں کھدوا دیئے
رعایا کے آرام کے لئے جابجا گھاٹ بنوا دیئے

ملکہ معظمہ کی پنجاہ سالہ جبلی کی یادگار میں ڈیڑھ لاکھ روپے کے

صرفہ سے ایک نہر تیار کرائی جس سے شہر کے وہ حصّے بھی سیراب ہو گئے جہاں پانی کی سخت ضرورت تھی۔

محکمہ ڈسپنسریز مقرر کیا۔ پرگنوں میں یونانی و ڈاکٹری شفا خانوں کا بندوبست فرمایا۔ خاص بھوپال میں بہت سے یونانی شفاخانے اور پرنس آف ویلز ہاسپٹل کھولا۔ لیڈی لینسڈاؤن ہاسپٹل کا افتتاح کیا جس میں عورتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ نیز اس میں دائیوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ جو مضافات کی عورتوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

مزدوری پیشہ طبقے کے لئے سات لاکھ کے صرفہ سے ایک عظیم الشان کاٹن مل قائم کی۔

انھوں نے ریاست میں ڈاک خانے جاری کئے تار برقی کے نہ ہونے سے بہت تکلیف اور کاروباری اور تجارتی دقتیں تھیں۔ ہزاروں روپیہ صرف کرکے تار برقی کا سلسلہ جاری کرادیا۔

بھوپال میں ریلوے نہ تھی علاوہ آمدورفت اور تجارتی تکالیف کے اس کے نہ ہونے سے ایک دقت یہ تھی کہ قحط کے زمانے میں جس کے یہاں اکثر حملے ہوتے رہتے تھے سخت تکلیف کا سامنا ہوتا تھا۔ اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ ریلوے نکالی جائے۔ چنانچہ بڑی پٹری کی لائن ۱۳۰۲ھ میں اٹارسی سے نکالی گئی جو بینا، جھانسی اور گوالیار ہوتی ہوئی ٹونڈلہ

سے ملا دی گئی۔ اس ریلوے کے لئے بیگم صاحبہ نے پچاس لاکھ روپے دئے جس سے علاوہ بہت سے آرام اور آسانیوں کے یہ بھی ہوا کہ ایک بہت بڑی رقم ان روپیوں کی آمدنی کی ہر سال ریاست کے خزانے میں داخل ہوتی ہے

۱۸۹۶ء میں بھوپال سے ایک شاخ اجین کو نکالی گئی۔ حدود ریاست میں اس ریلوے کی تعمیر کا صرفہ انیس لاکھ تھا جو ریاست کے خزانے سے دیا گیا۔ اس کی آمدنی بھی سالانہ ریاست کو ملتی ہے۔

ریاست کی خاص علامتوں میں سے ایک علامت سکہ بھی ہے اور ہر رئیس کو اپنے نام کا سکہ محبوب ہوتا ہے۔ ریاست بھوپال میں بھی ایک جداگانہ سکہ خاص ریاست کا رائج تھا جو وہیں کے دارالضرب میں مسکوک ہوتا تھا۔ مگر انگریزی روپے سے تبادلے میں اس پر مختلف اوقات میں مختلف بٹہ لگتا تھا جس سے تجارت کے معاملات میں پیچیدگیاں پڑ جاتی تھیں۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے محض رعایا کے آرام کے خیال سے اس سکے کو اٹھا دیا اور اس کے بجائے ۱۳۱۵ھ سے سکہ انگریزی ریاست میں جاری کر دیا۔

انھوں نے بھوپال میں انگریزی تعلیم کے لئے ایک ہائی اسکول کھولا

ایک بہت بڑا مدرسہ جہانگیریہ اپنے محترم باپ جہانگیر محمد خاں کے نام سے جاری کیا جس میں سینکڑوں طلبار کو تعلیم کے لئے وظیفے دیئے جاتے تھے۔ نیز نواب صدیق الحسن خاں مرحوم کے مزار پر بھی ایک مدرسہ قائم کیا۔ پرنس آف ویلز کے نام سے ایک صنعت و حرفت کا اسکول کھولا جس میں دری بافی، نواڑ، چکن، قالین، خیمہ دوزی، سلائی کا کام وغیرہ بہت سی چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔

اپنے نام سے ایک مطبع شاہجہانی قائم کیا جہاں سے ہفتہ وار ایک اخبار عمدۃ الاخبار کے نام سے جاری کیا۔

ان کی ان تمام کوششوں پر گورنمنٹ نے بہت خوشنودی ظاہر کی اور ان کی معدلت گستری اور رعایا پروری کی کیفیت سن کر ملکہ معظمہ نے ازراہِ قدر دانی ۱۲۸۹ھ میں جی، سی، ایس، آئی۔ اور پھر ۱۲۹۶ھ میں کراؤن آف انڈیا کا خطاب عطا فرمایا۔ کلکتہ اور بمبئی کے درباروں میں نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ وہ شریک کی گئیں۔

۱۲۹۳ھ کے دہلی دربار میں ملکہ معظمہ کی طرف سے ان کو نشانِ شاہی اور تمغۂ قیصر ہند عطا ہوا۔

جنگ روم و روس میں انھوں نے دو لاکھ روپے مسلمان مجروحین جنگ کی تیمارداری اور ان کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کے لئے بھیجے

تھے اس کے صلے میں سلطان عبدالحمید خاں نے تمغۂ شفقت درجہ اوّل اور شکریہ کے خطوط بھیجے۔

ان کے عہد میں ریاست کا اعزاز بہ نسبت سابق کے بہت بڑھ گیا۔ بڑے بڑے انگریزی حکام وہاں آنے لگے۔ لارڈ فریڈرک رابرٹس کمانڈر انچیف افواج ہند۔ لارڈ لینسڈاؤن، لارڈ ایلگن اور لارڈ کرزن اپنے اپنے عہد میں بھوپال میں رونق افروز ہوئے اور بیگم صاحبہ کی شاہانہ مہمان نوازی کی بہت تعریف فرمائی۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے پہلے شوہر نواب باقی محمد خاں ۱۲۸۴ھ میں انتقال فرماگئے۔ اس کے بعد بعض خیر خواہوں نیز سرکاری افسروں نے بیگم صاحبہ کو نکاح ثانی کا مشورہ دیا۔

باوجود اس کے کہ نکاح ثانی ہندوستان کے مسلمانوں بالخصوص امرا کے گھرانوں میں ہندوؤں کے اثر سے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن انھوں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا اور شرع شریف کے حکم کے مطابق نواب صدیق الحسن خاں صاحب سے جو ریاست کے میر دبیر تھے اور بلحاظ سیادت خاندانی وفضل وکمال وسیرت وصورت کے پسندیدہ معلوم ہوئے بمنظوری گورنمنٹ نکاح ثانی کر لیا۔

لیکن چونکہ یہ نکاح ایک غیر کفو کے شخص سے ہوا تھا۔ اس لئے

قدرۃً کچھ ایسے خانگی جھگڑے پیش آئے کہ جس سے بیگم صاحبہ اور ان کے قریب ترین اعزہ میں سخت ناچاقی واقع ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ شہر چھوڑ کر تاج محل میں چلی گئیں اور پھر ایک چوتھائی صدی یعنی مرتے دم تک شہر میں نہ آئیں اور نہ اُن عزیزوں سے ملنا گوارا کیا۔

عالی دماغ لوگوں کی زندگی کا خاتمہ اکثر درویشی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بیگم صاحبہ کی طبیعت پر بھی آخری زندگی میں درویشی بہت غالب آگئی تھی۔ تلاوت، ریاضت اور عبادت میں اُن کے اوقات بسر ہوتے تھے۔

ان کے زمانے میں شہر میں جو اسلامی شان اور رونق تھی وہ اب تک زمانے میں مشہور ہے۔ خانقاہیں آباد تھیں اور مسجدیں معمور۔

اِن کا زمانہ بھوپال کے لئے بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ باغ میں بہار کا زمانہ ہوتا ہے۔ اُن کی داد و دہش اور فیاضی کی وجہ سے دیار و امصار کے لوگ کھنچے ہوئے بھوپال میں چلے آتے تھے۔ شام و عرب تک کے اہلِ علم کو وہاں کی کشش کھینچ لاتی تھی اور سب کا دامنِ آرزو اُن کی فیاضی سے مالا مال ہوتا تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا نمایاں وصف فیاضی ہے جو کہ انسان کے اخلاق میں سب سے بہتر خلق شمار کیا گیا ہے۔ وہ غریبوں کو سینکڑوں من غلّہ تقسیم کراتی تھیں۔ اُنھوں نے سدا برت اور لنگر خانے جاری

کر رکھے تھے۔ بہت سے غریبوں کے لئے گذارہ مقرر تھا کئی ایک محکمے اسی قسم کی امداد کے لئے قائم تھے۔ بالخصوص محکمۂ مصارف جہاں سے سیکڑوں اہل استحقاق کو ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

۱۸۹۹ء کے سخت قحط میں اُنھوں نے بڑی فیاضی کی۔ ہزاروں آدمیوں کی جانیں بچائیں۔ بہت سے خاندانوں کو بربادی سے محفوظ رکھا۔ علاقہ جات غیر کی قحط زدہ رعایا جو اُن کی ریاست میں آگئی اس کو بھی بھوک کی تکلیف سے بچایا۔

وہ کسی کو محروم کرنا نہیں جائز رکھتی تھیں۔ اور یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے۔ انھوں نے خود فرمایا ہے اور سچ فرمایا ہے ؎

رستیم شجر وار بگلزار امارت
غیر از کرم و جود نباشد ثمر ما

ان کو بھی اپنے ہمنام بادشاہ شاہجہاں کی طرح عمارت کا بہت شوق تھا۔ بھوپال کے باہر شاہجہاں آباد ایک پورا شہر کا شہر تعمیر کرایا۔ تاج محل عالی منزل۔ نواب منزل اور بے نظیر وغیرہ بہت سی عالی شان عمارات وہاں کی قابل دید ہیں۔

تاج المساجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ انتقال فرما گئیں۔ یہ مسجد اس قدر عالیشان

ہے کہ باوجود اس کے کہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے سولہ لاکھ روپے اس کی تعمیر میں خرچ ہو چکے ہیں۔ سات لاکھ روپے کے صرفہ سے انگلستان میں اس کے لئے بلوریں فرش تیار کرایا گیا۔ لیکن علماء نے اس پر نماز ناجائز قرار دیدی۔ کیونکہ نماز پڑھتے وقت آدمی کی پوری صورت اس میں نظر آتی ہے۔

بیگم صاحبہ کے اندر علمی اور ادبی مذاق بھی تھا۔ اُن کی تصنیفات سے کئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں امراء اور روسا کی زیادہ تر تصانیف ان کی قدردانی اور ہنر پروری کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن کم سے کم اس سے ان کی علمی دلچسپی کا ثبوت ضرور ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ کی علمی دلچسپی اس وجہ سے اور ترقی کر گئی تھی کہ اُن کے شوہر مولوی صدیق حسن خان علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ اِن کی سینکڑوں تصنیفیں اردو، فارسی اور عربی میں ہندوستان سے لے کر مصر و عرب و روم تک شائع ہوئیں۔

علا[redacted] بریں بیگم صاحب کے دربار میں بہت سے علماء و فضلاء کا مجمع رہتا تھا جن میں سے اکثر صاحب تصنیف تھے۔ وہ اُن سے فرمائش کر کر کے کتابیں لکھواتی تھیں اور انعام و اکرام سے مالامال کر دیتی تھیں

انھوں نے ایک کتاب تہذیب نسواں وتربیۃ الانسان عورتوں کی ضروریات
کے لئے لکھی ہے۔

دوسری کتاب خزانۃ اللغات ہے اس میں اردو الفاظ
کی فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور سنسکرت سب کچھ لکھ دی ہے
تاج الاقبال فی تاریخ بھوپال۔ ریاست کی تاریخ انھوں نے لکھی
یہ کتاب فارسی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں ہے۔ اگرچہ اس کتاب
کا مواد سکندر بیگم نے جمع کیا تھا۔ لیکن جس خوبی کے ساتھ وہ ترتیب دیا گیا
ہے۔ اس کے لحاظ سے وہ قلم نہایت عزت کے قابل معلوم ہوتا ہے
جس نے اس کو لکھا۔

اس میں آغاز ریاست سے اپنی صدر نشینی کے چار سال بعد تک
کے واقعات لکھے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے تیس سال تک جو مواد
تاریخی جمع کیا۔ کثرت مشاغل سے اپنی زندگی میں اس کو شائع نہ فرماسکیں
اور افسوس ہے کہ ان کے بعد وہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا۔

بیگم صاحبہ شاعر بھی تھیں۔ ان کے دربار میں شعرا کا بھی اچھا
خاصا مجمع رہتا تھا۔ وہ پہلے شیریں تخلص کرتی تھیں۔ پھر تاجور بدل دیا۔
انھوں نے ایک مثنوی صدق البیان لکھی ہے۔ اور مثنویوں کی
طرح اس میں کوئی مسلسل قصہ شروع سے آخر تک نہیں ہے۔ بلکہ کہیں

ہولی کا بیان ہے، کہیں بسنت کا۔ کہیں برسات کا۔ کہیں دیوالی وغیرہ کا۔ یہ مثنوی اُن کے افتادِ مزاج کے بالکل مطابق ہے۔ کیونکہ ان کو چہل پہل اور دھوم دھام بہت پسند تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر بڑے بڑے جشن کر دیتی تھیں اور بیدریغ لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیتی تھیں۔

اس مثنوی میں بیچ میں سلطنت دہلی کا بیان بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس میں امیر تیمور کا مقابلہ پرتھی راج سے دکھایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تصنیف ہے جبکہ صحیح تاریخی معلومات ان کو حاصل نہیں تھیں۔

اس مثنوی کے علاوہ ان کے دو دیوان غزلیات وغیرہ کے ہیں دیوان شیریں اور دیوان تاج الکلام۔ لیکن ہم کو افسوس ہے کہ یہ ناموزوں زیور اُن کے شاہانہ قلم پر کیوں باندھا گیا۔

نمونتاً حمدِ الٰہی میں ایک غزل دیوانِ تاج الکلام سے نقل کرتے ہیں۔

اپنی قدرت سے نمایاں حق نے کیا جلوہ کیا
حور و غلماں جن و انسان و ملک پیدا کیا
صورت و سیرت بنائی مختلف ہر ایک کی
خلق کا نقشہ مرتب جس طرح چاہا کیا

اپنی قدرت سے کئے پیدا بہت انواع خلق
پر بشر کا سب سے بڑھ کر منصب و رتبہ کیا
حضرتِ انساں کو بخشی دانش و فہم و ذکا
اپنے وصفوں کا نمونہ اس میں سب پیدا کیا
تاجور رہے حمد کے لائق وہی ذاتِ قدیم
جس نے قدرت سے زبانِ خلق کو گویا کیا

دیوان کے آخر میں بہت سی پہیلیاں لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ اس سے ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں سے چند ہم درج کرتے ہیں

پہیلی سوئیں

کوٹ کے نر کو تار بنائیں — توڑیں تاریں ملیں ملائیں
اینچیں کھینچیں کاٹیں بال — بھوجن کرلو میرے لال

پہیلی مشک

چھوٹا سا منہ بڑا سا پیٹ — جل کو دیکھے جا دے لیٹ
وہ تریا ہے ایسی ڈھیٹ — چلتے منش کی لاگے پیٹ

پہیلی ڈولی

چار خصم کی ہے اک نار
ٹھکے ٹھکے پر پھرے بزار

پہیلی چراغ

عجب تلیا پیمرس اور رین ہی رین سہلے

اے سکھی میں تو سے پوچھوں پھول بیل کو کھائے

فارسی کے اشعار بھی کہتی تھیں۔ اگرچہ اُن کے فارسی اشعار کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا لیکن بہت سے تذکروں مثلاً شمع انجمن، نگارستان سخن، صبح گلشن، روز روشن، اختر تاباں، ماہِ درخشاں، طور کلیم اور حدائق عشرت وغیرہ میں اُن کے اشعار دیکھنے میں آئے۔ کتاب تذکرۃ الخواتین میں بیگم صاحبہ کی یہ غزل مندرج ہے۔

ہر دم زحسنِ یارِ من ریزد تجلائے دگر

چشمم بود در ہر نظر محوِ تماشائے دگر

خوبانِ دُنیا گو ہمہ خوبند از سر تا بپا

نامِ خدا آں دلربا دارد سراپائے دگر

از بوریائے زاہداں بوئے ریا آید بجاں

بہر نماز عاشقاں باید مصلائے دگر

باور مکن قولِ عدو ساغر کجا و شیشہ کو

اے محتسب ایں بارِ دہ وارم صہبائے دگر

من می روم سوئے حرم دل میکشد سوئے صنم

من می ادم جائے دگر دل می دہم جائے دگر

جانم بتنگ آمد از و، یارب چساں سازم بدو

من می نہم رائے دگر، اومی زند رائے دگر

اے عشق بے پروا بیا، تا وارہم از ما سوا

جز درد تو بنود مرا در دل تمنائے دگر

شاہجہانم بے گماں، ہم تاجور در ہندیاں

جز یاد دلدار در جہاں دارم نہ سودائے دگر

۱۳۱۹ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں ۴۳ برس ریاست کرنے کے بعد انتقال فرمایا اور اپنے باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم

علیاحضرت ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج الہند جی سی ایس آئی۔ جی سی آئی اے فرماں روائے بھوپال

ہر ہائنس کے والد ماجد نواب اُمراؤ دولہ باقی محمد خاں اور والدہ ماجدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ ہیں۔ ۲۷ ذی قعدہ سنہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۹ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئیں۔

اسی سال ہندوستان میں غدر سے امن و امان ہو چکا تھا اور اس ملک کی حکومت کمپنی کے ہاتھ سے ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں منتقل ہوئی تھی ہر ہائنس کی نانی نواب سکندر بیگم صاحبہ نے ان کی ولادت پر بڑی خوشی کی چھ مہینے تک جشن رکھا۔ غربا اور مستحقین کو انعام و خلعت عطا کئے اور طرح طرح سے خوشی کا اظہار کیا۔

ان کی ولادت کے بعد ہی نواب سکندر بیگم صاحبہ مستقل رئیسہ تسلیم کی گئیں اور سنہ ۱۲۷۵ھ میں بیرسیہ کا پرگنہ گورنمنٹ کی طرف سے ملا اور پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد استار آف انڈیا کا تمغہ ان کو عطا

ہوا۔ بعد ازاں خلعت بھی۔ ان وجوہات سے وہ ہر ہائنس کو نہایت مبارک سمجھتی تھیں۔ اور بڑی شفقت کے ساتھ تربیت فرماتی تھیں۔

۵ سال کی عمر میں نہایت دھوم دھام سے بسم اللہ کی تقریب ہوئی اور ہر ہائنس کی تعلیم کا ضابطہ معین کیا گیا۔

کلام مجید، تفسیر، خوش خطی، فارسی، انگریزی اور پشتو ان تمام چیزوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ آبائی فنون سپہ گری مثلاً سواری، بانک وغیرہ بھی سکھلائے جانے لگے۔

ہر ہائنس کو مصوری سے خاص دلچسپی تھی اور وہ دلچسپی اب تک قائم ہے۔ اگرچہ مہمات ریاست اور کثرت مشاغل سے وقت نہیں ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس کی مشق جاری رکھتی ہیں۔

چنانچہ ۱۳۲۰ھ میں حج سے واپسی کے موقع پر بمبئی سے دو ایک پارسی لیڈیوں کو جو اس فن میں مہارت رکھتی تھیں اپنے ساتھ ریاست میں لائیں اور ان سے اس فن کی مشق بہم پہنچائی۔ اب [redacted] بلا مدد غیرکے تصویریں بنا لیتی ہیں۔

۱۲۸۴ھ میں ان کے نامور باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں جبکہ ہر ہائنس کی عمر دس سال کی تھی نواب سکندر بیگم صاحبہ کا بھی سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی

تعلیم و تربیت انکی والدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی زیر نگرانی جاری رہی اسی سال یعنی ۱۲۸۵ھ میں جب اُن کی والدہ صدر نشین ہوئیں تو اُن کو ولی عہدی کا خلعت ملا۔ باوجود کم سنی کے اس موقع پر بر سر دربار شکریہ ادا کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کو سن کر اُن کی جرأت اور لیاقت پر لوگوں کو تعجب ہوا۔

۱۲۸۵ھ میں ان کے کلام مجید ختم کرنے کے موقع پر نشرہ کی رسم بڑی شان و شوکت کے ساتھ کی گئی۔ ایک مہینے تک شب و روز جشن رہا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ اس تقریب میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے صرف کیا۔

ہر ہائنس کی شادی کے لئے نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنی زندگی ہی میں جلال آباد کے ایک اپنے ہی ہم قبیلہ نوجوان نواب احمد علی خاں صاحب کو جو نجیب الطرفین، خوش رو خوش وضع اور خوش اخلاق تھے منتخب فرمالیا تھا اور اپنی ہی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت بھی کی تھی۔

۱۲۹۱ھ میں جب ارکان ریاست سے مشورہ اور گورنمنٹ سے استصواب وغیرہ کے تمام مراحل طے ہوگئے تو ۲۳ ذی الحجہ کو نواب صاحب موصوف کے ساتھ نہایت دھوم دھام سے عقد کیا

گیا۔ دو کرور کا مہر قرار پایا۔ اور چالیس ہزار سالانہ کی جاگیر توشہ کو عطا ہوئی۔ اس تقریب میں ساڑھے چھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔

ہر ہائنس کے پانچ اولاد ہوئیں۔

(۱) بلقیس بیگم صاحبہ — ولادت ۱۴ رمضان ۱۲۹۲ھ

(۲) نواب نصر اللہ خاں بہادر (جو اب ولی عہد ریاست ہیں) — ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۹۳ھ

(۳) صاحب زادہ حافظ کرنل محمد عبید اللہ خاں بہادر — ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ

(۴) صاحب زادی آصف جہاں بیگم صاحبہ — ۲۵ شعبان ۱۲۹۷ھ

(۵) صاحب زادہ محمد حمید اللہ خاں بہادر — ۸ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ

بلقیس جہاں بیگم ساڑھے بارہ سال کی ہو کر ۱۳۰۵ھ میں والدین کو داغ مفارقت دے گئیں۔ اور اسی طرح صاحبزادی آصف جہاں بیگم نے بھی ۱۴ سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ میں انتقال فرمایا۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ۱۲۸۸ھ میں چونکہ مولوی صدیق حسن صاحب سے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اس وجہ سے کچھ خانگی جھگڑے ایسے پیش آئے کہ جن سے ماں بیٹی میں باہم رنجش پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے ہر ہائنس نے کامل ۲۷ سال تک رنج بھری اور تنہائی کی زندگی گذاری۔ نہ اپنی والدہ ماجدہ سے مل سکتی تھیں نہ ارکان ریاست اُن سے ملنے

پاتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب نواب شاہجہاں بیگم نے وفات پائی اس وقت عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں آئی۔ انھوں نے دیکھا کہ قحط اور سابقہ بدنظمیوں کی وجہ سے ریاست کی حالت نہایت ابتر تھی۔ آبادی تقریباً ایک ثلث گھٹ گئی تھی۔ خزانے میں کل چالیس ہزار روپے تھے اور اس سال کی تمام آمدنی صرف ۱۸ لاکھ تھی۔

یہ دیکھ کر نہایت جستی اور جانفشانی کے ساتھ ریاست کے کام میں مصروف ہوئیں اور اپنے محترم شوہر احتشام الملک عالی جاہ نواب احمد علی خاں صاحب کی مدد اور مشورہ سے نہایت قابلیت کے ساتھ انتظام کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی ریاست ملے ہوئے پورے سات مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ قضائے الٰہی سے ۲۳ رمضان ۱۳۱۹ھ کو نواب صاحب موصوف دفعتاً انتقال کر گئے۔

ہر ہائنس کے لئے یہ صدمہ نہایت سخت اور یہ موقع بڑی آزمائش کا تھا۔ مدت العمر کی خانہ نشینی کے بعد ریاست کا عظیم الشان بار ان کے سر پر پڑا اور اس بار کے اٹھانے میں جس سچے خیرخواہ اور حقیقی مشیر سے مدد کی توقع تھی وہ یکایک اس طرح اٹھ گیا۔ اب ہر ہائنس کو ان کی بے وقت اور اچانک موت کے بھاری صدمہ کے ساتھ ریاست کا بوجھ بھی تنہا

ہی اُٹھانا پڑا۔

جو لوگ ہر ہائنس کی حالت سے ناواقف تھے اور کارکن فرد نواب صاحب مرحوم کو سمجھتے تھے ان کو نواب صاحب کے انتقال کر جانے سے ریاست کی اصلاح سے مایوسی ہو گئی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد علیاحضرت نے ریاست کو ترقی دے کر اور اس کے تمام صیغوں کی اصلاح کر کے روزِ روشن کی طرح یہ ثابت کر دیا کہ درحقیقت اصلی کارکن فرد انھیں کی ذات والاصفات تھی۔ اُنھوں نے اپنی خاموشی اور خانہ نشینی کے ۲۷ سال بے کار نہیں کھوئے ہیں بلکہ بہت غائر نظر سے ریاست کے ہر شعبہ کو دیکھتی رہی ہیں۔ تو شاید کے اس قول کی مصداق اصل میں علیاحضرت ہیں لہ

دریں پردہ با خود بہ بازی نیم — شب و روز بے چارہ سازی نیم
من ازچہ زنم زنِ سیر نیستم — زِکار جہاں بے خبر نیستم

درحقیقت [redacted] اپنے سر میں ایک بیدار مغز رکھتی ہیں اس جانکاہ غم نے اُن کے حوصلے کو پست نہیں کیا۔ اور باوجود اس کے کہ وزیر ریاست نے بھی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے استعفا دے دیا۔ ہر ہائنس نے خود تن تنہا ڈیڑھ سال تک ریاست کا کام انجام دیا۔ باوجود شدت گرما کے انھوں نے متعدد اضلاع میں دورے کئے۔ رعایا کی اصلی

کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی اور بہت کچھ ان کی شکایات کا سدباب کیا۔

ایک فوری بندوبست پنج سالہ تمام ریاست میں کرایا جس میں کہ بہت سا مستاجروں کے ساتھ ساڑھے پانچ لاکھ روپے کی مالیہ میں رعایت کی تاکہ رعایا خوش حال رہے۔

ریاست کے تمام صیغوں کی طرف انھوں نے اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ سب سے پہلے اس کی مالی حالت کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور جدید طریقے سے اس کا انتظام فرمایا جس کی بدولت سال اول میں تقریباً تین لاکھ اور سال دوم میں ساڑھے چھ لاکھ روپے کی آمدنی میں بیشی ہوئی۔ اخراجات کی زیادتی پر نظر کر کے بعض فضول دفاتر کو شکست کر دیا۔ صیغہ مناصب سے بہت سے غیر مستحق تنخواہ پا رہے تھے، اس میں تخفیف فرمائی۔

محکمہ عدالت کی طرف بھی توجہ کی اور وکلا کے امتحان کا طریقہ مقرر کیا۔ بعض قوانین مجریہ ریاست کو از سر نو مرتب کرایا اور ریاست کے اسٹامپ کی اصلاح کی۔

فوج کی طرف جو خصوصیت کے ساتھ ان کی دلچسپی کا مرکز ہے زیادہ توجہ منعطف فرمائی۔ اور علاوہ رسالہ باڈی گارڈ کی اصلاح کے ریاست

کی تمام فوج کو اس قابل بنا دیا کہ وہ بھی انگریزی سپاہ کی طرح بروقت ضرورت گورنمنٹ کی خدمات کرسکے۔ ایک فوجی مدرسہ بھی قائم کیا۔

پولیس کی اصلاح کی اور ۳۵۳ آدمی کی جمعیت کو فوج سے نکال کر ماؤنٹیڈ پولس کا اضافہ کیا۔ جدید چوکیات قائم کیں جن سے جرائم میں کمی ہوئی۔ اس کے ساتھ جیل میں بھی اصلاح کی۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے اصول پر شہر بھوپال میں جماعت انتظامیہ قائم کی جس کی کارروائیوں کی اشاعت کے لئے ایک ہفتہ وار گزٹ سرکاری مطبع سے نکلنا شروع کیا۔

ریاست میں ذرائع آبپاشی مہیا کرنے کے لئے ڈھائی ہزار روپے ماہوار کے صرفہ سے ایک محکمہ قائم کیا اور صنعت و حرفت کو رواج دینے کے لئے بھی ایک کمیٹی قائم کی۔

سب سے زیادہ جس چیز کی طرف علیا حضرت نے توجہ فرمائی وہ تعلیم ہے، چونکہ وہ خود تعلیم یافتہ تھیں اس لئے تعلیم کی بے انتہا حامی ہیں انھوں نے عملاً اس کی مثال قائم کی اور اپنی اولاد کو نہایت اعلیٰ تعلیم دلوائی اپنے چھوٹے صاحب زادے کو علی گڑھ کالج میں بھیجا ہے جہاں وہ تعلیم پا رہے ہیں۔

ریاست میں اخوان و اراکین ریاست کے بچوں کی تعلیم کے لئے الیگزنڈرا ہائی اسکول کھولا مسلمان لڑکیوں کے لئے ۱۹۰۲ء میں مدرسہ

سلطانیہ اور ہندو لڑکیوں کے لئے برجیسہ کنیا پاٹ شالا قائم کیا۔

عورتوں کی بسر اوقات کے لئے صنعت و حرفت کے نام سے ایک مدرسہ چندہ سے قائم کرایا تاکہ ریاست کے لوگ آپ اپنی مدد کرنے کے عادی ہوں۔ اس میں بھی زیادہ اپنی ہی امداد شامل رکھی۔ اس مدرسہ میں جو عورتیں کام سیکھنے کے لئے داخل ہوتی ہیں ان کو عہ سے ہے تک ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے۔

صاحبزادی آصف جہاں بیگم مرحومہ کے نام سے طب یونانی کی تعلیم کے لئے مدرسہ طبی آصفیہ قائم کیا۔ تاکہ عمدہ یونانی دوائیں دستیاب ہو سکیں یونانی ادویہ کی بھی ایک دکان کھلوائی۔

ہر ہائنس کی تعلیمی کوشش کا دائرہ صرف اپنی ریاست ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اُن کا بارانِ فیض تمام ہندوستان پر برسا۔ ہندوستان کی کوئی مفید اسلامی انجمن یا درسگاہ شاید ہی اُن کے رشحاتِ فیض سے محروم رہی ہو۔ علی گڑھ کے حامیانِ تعلیم نسواں کے لئے، انہیں کی امداد کامیابی کا ذریعہ ہوئی۔ ندوہ اور دیوبند کے مدرسوں میں انھیں کے نسیم فیض نے ایک تازہ روح پھونکی۔ الغرض ان کی فیاضیوں کی فہرست بہت لمبی ہے اور علمی خدمات اور امداد کے لحاظ سے اس وقت علیا حضرت کا سایۂ فیض ہندوستان کے مسلمانوں کے سروں پر سایۂ ہما سے

کم نہیں ہے

ہر ہائنس اپنے زمانہ ولی عہدی سے شاہی درباروں میں شریک ہوتی رہی ہیں ۱۸۷۵ء اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ جاکر کلکتہ کے اس دربار میں شرکت فرمائی جو پرنس آف ویلس نے عطائے خطابات کے لیے منعقد فرمایا تھا۔ پھر انہیں کے ہمراہ ۱۸۷۷ء کے دہلی کے قیصری دربار میں اور ۱۸۸۴ء میں کلکتہ کے لارڈ رپن کے دربار میں شریک ہوئیں۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء میں شہنشاہی دربار دہلی میں بحیثیت رئیسہ ریاست شرکت فرما ہوئیں۔ ۲۴ جون ۱۹۰۴ء کو تبقریب سال گرہ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم ان کو جی، سی، آئی، ای کا خطاب ملا ۱۳۲۱ھ میں وہ مثل اپنی نانی سکندر بیگم صاحبہ کے ایک بڑا قافلہ ہمراہ لے کر حج کے لئے تشریف لے گئیں۔ حجاز میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے آپ کا نہایت اعزاز و احترام کیا گیا۔ اور بخیر و عافیت فریضہ حج ادا کرکے واپس تشریف لائیں۔ واپسی پر اپنا ایک سفرنامہ حج بھی مفصل مرتب فرمایا جو شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان کی آمد کے موقع پر آگرہ میں جو دربار ہوا اس میں بھی تشریف لے گئی تھیں۔ امیر صاحب نے پشتو اور فارسی میں گفتگو فرمائی اور علیا حضرت کی ملاقات

سے بہت خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا ؎

نہ انجیر شد نام ہر میوہ
نہ مثل زبیدہ است ہر بیوہ

سنہ ۱۹۱۲ء میں ملک معظم جارج پنجم کی رسم تاجپوشی کی شرکت کے لیے انگلینڈ تشریف لے گئیں اور نہایت اعزاز کے ساتھ شرکت فرماہوئیں۔ لندن کے علاوہ پیرس، جنیوا، بوڈاپسٹ وغیرہ یورپ کے مشہور شہروں کی سیر کی مصر کو بھی دیکھا اور قسطنطنیہ بھی تشریف لے گئیں۔ وہاں سلطان المعظم اور سلطانہ سے ملاقات فرمائی۔

ہر ہائنس کے اس سفر کے مفصل حالات اُن کی چھوٹی بہو شاہ بانو صاحبہ نے سفرنامہ سلطانی کے نام سے شائع کئے ہیں۔ اسی سال پھر دہلی کے دربار تاجپوشی میں شریک ہوئیں اور جی، سی، ایس، آئی کا خطاب پایا اس موقع پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ بھی دہلی میں تھا اس کے صیغہ تعلیم نسواں کے اجلاس میں بہ ہمدردی اسلام وحمایت تعلیم نسواں تشریف لائیں۔ اور کرسی صدارت پر رونق بخش ہو کر ایک پرمغز تقریر فرمائی

ہر ہائنس نے تاریخ بھوپال میں ایک کتاب تزک سلطانی دوسری گوہر اقبال شائع کی نیز اُن کی خود نوشت سوانح عمری کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ رفاہ عام کے خیال سے اُنھوں نے اِس سال

دو کتابیں اور بھی شائع کی ہیں۔ ایک بچوں کی پرورش اور دوسری تندرستی
ہر ہائنس کو بھی مثل اپنی والدہ ماجدہ کے تعمیر سے شوق ہے اپنے
لیے شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی ٹیکری پر نہایت عالیشان
کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ جہاں اور بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں اور اب احمد آباد
اس کا نام رکھا ہے۔ شہر کے مشرق میں عجائب خانہ نہایت عالی شان تعمیر
کرایا ہے۔

ٹیلیفون بھی بھوپال میں جاری کیا، اور برق کا محکمہ قائم کیا جس
سے برقی روشنی ہوتی ہے۔ اور پنکھے چلتے ہیں۔ اس کا ایک شعبہ علی گڑھ
کالج میں بھی بھیجا اور ہر ہائنس کے فیض سے یہاں بھی برقی پنکھے چلنے
لگے۔

اب شمسی حساب سے وہ اپنی زندگی کے ۵۵ سال اور
قمری حساب سے ۵۷ سال گذار چکی ہیں اور اپنے حکومت کے
فرائض کو نہایت عالی ہمتی، تندہی اور دانش مندی کے ساتھ
ادا کر رہی ہیں، وہ نہ صرف اپنی رعایا ہی کے دلوں
میں محبوب ہیں۔ بلکہ ہندوستان کے تمام لوگوں اور
بالتخصیص مسلمانوں میں نہایت ہردلعزیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ

ان کی مبارک زندگی کو عرصے تک قائم رکھے اور اقبال
میں ترقی عطا فرما دے۔

آمین

عالمات

قرۃ العین

اصلی نام زرین تاج ہے۔ حاجی مُلا محمد صالح قزوینی کی بیٹی تھی۔ جو ایران کے نامور علماء کے خاندان کا معزز رکن تھا۔ اس کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے۔ محمد صالح ایک مشہور فقیہہ تھا اور اس کے گھرانے کے لوگ بڑے بڑے عالم و فاضل تھے۔ اس کا بھائی حاجی ملا محمد تقی (قرۃ العین کا چچا) قزوین کا مجتہد تھا جس کی عزت و عظمت کا سکہ چاروں طرف ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ ملا محمد تقی کا بیٹا ملا محمد بہت بڑا عالم تھا اور علمی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ غرض قرۃ العین ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جس کا گھر بھر عالم و فاضل تھا اس لیے منجملہ ان قابلیتوں اور قوتوں کے جو فطرت نے نہایت فیاضی سے اس خاتون کے دماغ میں ودیعت کی تھیں۔ اس کی عالی خاندانی نے بھی اس کی ترقیات میں بہت کچھ مدد دی۔

قرۃ العین کو علم سے ایک طبعی مناسبت تھی اور [illegible] تس پر اس کی بے نظیر غور و خوض کی عادت علم کا بے حد شوق اور حصول علم میں

سخت محنت و کوشش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ برخلاف عام طبیعتوں کے بچپن سے علمی چرچوں کے سوا اسے اور کوئی شغل نہیں تھا قاعدہ کی بات ہے کہ جب چند علم دوست اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ہیں تو ضرور علمی مباحثے چھڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب قرۃ العین کے عزیز و اقارب ایک جگہ جمع ہو جاتے تو اسی قسم کے علمی تذکرے اور مباحثے ہوتے۔ قرۃ العین ان میں نہایت شوق سے شریک ہوتی اور نہایت غور سے ان باتوں کو سنتی۔

اس کا عالم باپ اور فاضل چچا جو اس کی ہونہار طبیعت سے خوب واقف تھے اور اس کی دماغی ترقی کو نہایت پیار و محبت سے دیکھتے تھے اسے اس قسم کے مباحثوں میں حصہ لینے اور اپنی رائے دینے کا ضرور موقع دیتے۔ اس کے نفیس اور پاکیزہ دلائل نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور بجائے خود اس قدر بے نظیر ہوتے کہ پھر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

حصول علم و فضل میں اس کی ان تھک کوششوں کا نیک قابل تعریف نتیجہ بہت جلد برآمد ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کے خداداد حسن اور عصمت و حیا کے ساتھ اس کی علمی واقفیت اور قابلیت و بلند خیالی کا شہرہ تمام شہر قزوین

میں ہوگیا اور یہ خاندان کی سرتاج اور شہر قزوین کی مایۂ ناز و افتخار سمجھی جانے لگی۔ سچ یہ ہے کہ قرۃ العین نہ صرف اپنے خاندان اور اپنے ملک کی موجبِ افتخار سمجھی جانے لگی، بلکہ یہ حسین، باحیا، عصمت مآب اور عالم و فاضل خاتون تمامی عورات ذات کے لئے مایۂ نازش اور وجہ تفاخر ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کو اس معزز بی بی کی برگزیدہ ذات پر فخر و ناز ہے۔

اسی زمانے میں قرۃ العین کی شادی ملا محمد سے جو حاجی ملا محمد تقی کا بیٹا اور قرۃ العین کا چچیرا بھائی تھا ہوئی۔ لیکن افسوس کہ اس باہمی مناکحت کا انجام اچھا نہیں ہوا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

قرۃ العین کے علمی مشاغل بدستور اسی جوش و خروش کے ساتھ جاری تھے اور وہ ہمیشہ انھیں اشغال میں مستغرق رہتی تھی بلکہ اب مذہبی اور علمی امور میں اس کی دلچسپی بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اب اس کی زندگی میں بہت بڑا تغیر واقع ہونے کو تھا۔ اور ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ انھیں دنوں میں اسے خبر ملی کہ ایک نوجوان شیرازی مرزا علی محمد ہے جس نے مہدویت کا دعوےٰ کیا ہے اور ایک انبوہ کثیر اس کا پیرو ہو گیا ہے۔ اس نے بھی مرزا علی محمد سے جس نے اپنا لقب باب اختیار کیا تھا سلسلہ خط و کتابت قائم کیا اور چند ہی روز

کی خط وکتابت کے بعد باب کی تعلیم کو سچے دل سے قبول کرلیا، اور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کی اشاعت وترویج میں بیدریغ کوشش شروع کردی، یہاں تک کہ اسی غرض سے اس نے سفر اختیار کیا اور کھلم کھلا بڑے دھڑلے سے وعظ کہنے لگی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں نہایت اختصار سے یہ بیان کر دینا کہ مرزا علی محمد باب کون تھا؟ اس نے مہدویت کا دعوے کیسے کیا؟ اس کی تعلیم کیا تھی؟ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مرزا علی محمد کا باپ تجارت کا پیشہ کرتا تھا اور اپنے وطن شیراز میں نہایت کامیاب تاجر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ظالم موت نے اسے اس بات کی مہلت نہ دی کہ اپنے لڑکے کی تعلیم وتربیت کر سکتا۔ اس کے بے وقت مرجانے اور اچانک سر سے باپ کا سایۂ عاطفت اٹھ جانے سے مرزا علی محمد کی جو بہت کم سن تھا اس کے ماموں نے پرورش کی، نہایت جانکاہی اور دلدہی سے اس کی تربیت کرنے کے بعد جب یہ شعور کو پہنچا ماموں نے اس کے آبائی پیشہ تجارت میں اسے لگا دیا۔ لیکن اس کی طبیعت کو اس پیشے کے ساتھ کچھ بھی مناسبت نہ تھی اس لیے وہ اس میں نہایت بددلی سے کچھ دنوں مشغول رہنے کے بعد شیراز سے چل کھڑا ہوا اور سیدھا کربلا پہنچا۔

یہاں حاجی سید کاظم کا جو شیخ احمد احسائی بانی فرقہ شیخیہ کے جانشین تھے بڑا شہرہ تھا اور ان کے علم وفضل کا ہر طرف چرچا تھا۔ ان کے درس میں شریک ہونے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے اور بڑے بڑے عالم اس نامور بزرگ کے خوانِ علم کے زلّہ خوار تھے۔ مرزا علی محمد نے ان سے شرف ملاقات حاصل کیا اور اس عالم متبحر کے شاگردوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد حاجی سید محمد کاظم نے اس جہان فانی سے رحلت کی، اور مرزا علی محمد کو شیراز جانا پڑا۔

حاجی سید کاظم کے شاگرد اب اس تشویش میں تھے کہ کسے اس بزرگ سید کا جانشین بنائیں۔ یہ لوگ اسی تردد میں سرگرداں تھے اور مرحوم کا کوئی قابل جانشین نہیں ملتا تھا۔ انھیں دنوں میں اتفاقاً ملا حسین بشروی کو جو حاجی سید کاظم کا شاگرد رشید تھا، شیراز جانا پڑا، اور یہاں مرزا علی محمد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سلسلہ گفتگو میں اپنے استاد کے جانشیں کے تقرر کا ذکر آیا۔ مرزا علی محمد نے ملا بشروی سے ان تمام باتوں کو پوچھنے کے بعد جو ایسے شخص میں ہونی چاہئیں اپنے آپ کو اس عہدہ کے لئے پیش کیا۔ اوّلاً تو ملا بشروی کو حیرت ہوئی کیونکہ جس زمانے میں مرزا علی محمد کربلا میں تھا اس کی لیاقت نہایت معمولی تھی، لیکن جب اس نے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی ایک

نئی تصنیف پیش کی اور بہت عمدگی سے مُلّا کے ہر سوال کا معقول اور تسلی بخش جواب دیا تو مُلا کو اس کی حیرت انگیز ترقی پر نہایت استعجاب ہوا اسی وقت اس نے مرزا کو اس کی لیاقت و قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے حاجی کاظم کا جانشین تسلیم کر لیا اور اپنے رفقاء کو اس کی خبر کر دی۔ جنھوں نے باتفاق مرزا علی محمد کو اپنے بزرگ استاد کا جانشین اور اپنا پیر و مرشد تسلیم کر لیا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مرزا علی محمد نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ اور نہ صرف اسی پر اکتفا کی بلکہ اپنا لقب باب اختیار کر کے ایک نئی شریعت تیار کی، اور ایک نئی تعلیم پھیلانے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان کی ہدایت و رہبری کے لئے "مشیت اولیٰ" کو ہمیشہ کسی نہ کسی انسانی صورت میں حلول کرنا پڑا ہے اور وہی پیغمبر کہلاتی ہیں حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک جتنے پیغمبر گزرے ہیں اگرچہ ہم انھیں جُدا جدا تصور کرتے ہیں اور اُن کی صورتیں بھی مختلف تھیں لیکن فی الحقیقت وہ سب ایک تھے۔ اور "مشیت اولیٰ" ہی ان مختلف صورتوں کے ذریعے سے بولتی تھی۔ اسی طرح اس کے اخیر ظہور حضرت محمد کے ۱۲۷۰ برس بعد "مشیت اولیٰ" نے میرزا علی محمد باب میں حلول کیا ہے اور اب اس کے ذریعے سے بولتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ

قائم رہے گا۔ اور ان ظہوروں کی کوئی انتہا نہیں جس طرح ہر ظہور کے وقت آئندہ ظہور کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح محمد صلعم نے باب کے متعلق مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے اور یہ بشارت دی ہے کہ ان کے بعد امام مہدی آنے والا ہے۔ حضرت محمد صلعم کی پیشین گوئی کے موافق اب اس کا ظہور ہو گیا ہے۔ اور وہ مرزا علی محمد باب شیرازی ہے۔

مرزا علی محمد نے اپنے دعویٰ رسالت کی صداقت کے لئے ایک کتاب بیان قرآن مجید کے جواب میں پیش کی اس کا دعویٰ تھا کہ جس طرح قرآن شریف محمد صلعم کی رسالت کی دلیل ہے۔ اسی طرح بیان باب کے دعوے کی صداقت کا کافی ثبوت ہے۔ اس نئی تعلیم نے جس کا ہم نے نہایت ہی اختصار سے یہاں ذکر کیا ہے۔ ملک میں ہل چل پیدا کر دی۔ تمام ملک ایران میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اکثر اس کے رفقا اور شاگرد اس سے پھر گئے اور مخالفت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو سخت سخت ایذا ئیں پہنچانے لگے۔

قزوین کا مجتہد حاجی ملا محمد تقی اس کا بہت بڑا زبردست مخالف تھا۔ ملا تقی کو پہلے ہی سے شیخ احمد احسائی اور اس کے مقلدین سے نفرت تھی۔ اب جبکہ اس نے اسی فرقے کے ایک آدمی کو لتنے بڑھنے

بڑے حیرت انگیز دعوے کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی دلی حقارت اور نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ باب کے خیالات کا وہ سخت مخالف تھا اور ان کو اور اس کے ساتھیوں کو کافر کہتا تھا۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایسے خاندان میں جس کے افراد کسی خاص فرقہ یا خیال کے سخت دشمن ہوتے ہیں۔ ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو اسی خیال کا بہت بڑا حامی اور موید ہوتا ہے اسی طرح حاجی محمد تقی کے خاندان میں جو باب اور اس کی تعلیم کا بہت بڑا دشمن اور بابیوں اور شیخیوں سے سخت نفرت کرنے والا تھا قرۃ العین پیدا ہوئی باب کے دعوے مہدویت و رسالت کرنے کے بہت پہلے حاجی سید کاظم کی زندگی میں وہ ایک بار کربلا گئی تھی۔ جہاں اس نے اس عالم متبحر اور اس کے بڑے بڑے شاگردوں سے ملاقات کی اور ان لوگوں کے علمی مجالس میں شریک ہوئی تھی۔ حاجی کاظم کے انتقال کے بعد جب اس بزرگ کے شاگرد اس تشویش پریشانی میں تھے کہ کسے اپنے استاد کا جانشین قرار دیں۔ قرۃ العین نے حاجی کاظم کے شاگرد رشید ملا حسن بشرویی کو جس سے کربلا میں شناسائی ہو گئی تھی خط لکھا کہ جب وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہوں اور کوئی مرشد کامل ملے تو ضرور مطلع کریں۔

اسی اثنا میں جب ملا بشروی نے شیراز کا سفر کیا اور مرزا علی محمد سے ملاقات کی اور اسے اپنا پیر و مرشد اور اپنے بزرگ استاد کا جانشین تسلیم کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تو اس نے فوراً قرۃ العین کو خبر کی کہ جس بزرگ کے ہم منتظر تھے اور جس کی تلاش میں سرگرداں تھے اُسے پالیا اس کے ساتھ ہی ملا حسن بشروی نے قرۃ العین کا خط باب کو بتلایا جس نے اس معزز خاتون کی لیاقت اور قابلیت علم و فضل، مذہبی اور علمی امور سے دلچسپی کی جس کا اس خط سے بخوبی پتہ چلتا تھا، نہایت تعریف کی اور اسے اپنے اصحاب میں شامل کیا۔

اس کے بعد جب مرزا علی محمد نے مہدویت کا دعوے کیا اور صرف دعویٰ مہدویت ہی پر اکتفا نہ کر کے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا یعنی رسالت کا دعوے کرنے لگا۔ اس وقت قرۃ العین کا اس سے سلسلۂ خط و کتابت قائم ہو چکا تھا۔ قرۃ العین نے اس نئی تعلیم اور نئی شریعت کو بدل و جان قبول کر لیا اور اس کی بے حد دلدادہ اور اس کی اشاعت و ترویج میں نہایت جوش سے کوشاں ہو گئی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس نے اسی غرض سے گھر بار تک چھوڑا اور اس نئے مذہب کے پھیلانے میں ہمہ تن مستغرق ہو گئی۔

سب سے پہلے وہ اس غرض سے کربلا گئی اور وہاں اپنی خداداد

فصاحت اور لیاقت کے وہ کرشمے دکھلائے کہ ہر روز اس کے لکچر سننے کو ایک مجمع کثیر جمع ہو جاتا اور روزانہ بہت سے لوگ اس نئی تعلیم اور شریعت کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ علمائے شہر نے حاکم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور شکایت کی کہ یہ نوجوان عورت کربلا میں کفر پھیلا رہی ہے اور اپنی فصاحت خداداد اور اپنے حسن دلاویز سے شہر کے نوجوانوں کو ورغلا کر گمراہ کر رہی ہے۔ گورنر نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا قرۃ العین کو پہلے ہی سے اس کی خبر مل گئی اور اسی وقت کربلا سے بغداد روانہ ہو گئی۔

بغداد پہنچ کر اولاً وہ مفتی سے ملی اور اپنے خیالات نہایت عمدگی سے بیان کئے اور اپنا بغداد آنے کا مقصد بھی ظاہر کیا۔ مفتی نے بغداد کے گورنر سے اس بارہ میں رائے طلب کی اور باتفاق یہ طے پایا کہ اس کے بارے میں گورنمنٹ سے اجازت لی جائے۔ سلطنت عثمانیہ نے اس بات کی اجازت نہیں دی۔ لہذا قرۃ العین کو مجبوراً بصد ناامیدی بے نیل مرام بغداد سے واپس ہونا پڑا۔

اس جواں مرد پرجوش خاتون نے ہمت نہ ہار کر ہمدان کا قصد کیا اور نہایت جوش و خروش سے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ ہمدان میں بھی اس کے لیکچر بے اثر نہ رہے اور ایک معقول جماعت کو جس

میں اکثر بڑے بڑے عالم تھے بابی بنا لیا۔

مرزا علی محمد اس کی ان تمام بے نظیر انتھک کوششوں اور ان کے نتائج سے نہایت خوش ہوا۔ اور جب بعض کم فہم اور کوتاہ اندیش بابیوں نے اس سے استفسار کیا کہ آیا ایک عورت کا اس طرح وعظ کرنا اور کھلم کھلا لکچر دینا اچھا ہے تو اس نے نہایت جوش سے اس کی تعریف کی اور اس کو جناب طاہرہ کے معزز لقب سے ملقب فرمایا چنانچہ اب تک وہ اسی نام سے بابیوں میں یاد کی جاتی ہے۔

ہمدان سے قزوین واپس آنے کے بعد قرۃ العین کو ایک ایسا بڑا خیال پیدا ہوا جس سے اس جوان مرد عورت کی اولوالعزمی، ہمت جوش اور جرأت کا کسی قدر پتہ چلتا ہے۔ اس نے قصد کیا کہ طہران جاکر محمد شاہ۔ شاہ ایران کو بابی بنا لے۔ اس عظیم الشان ارادہ سے وہ قزوین سے طہران روانہ ہو گئی۔ ابھی وہ طہران نہیں پہنچی تھی کہ اس بات کی خبر حاجی محمد صالح (قرۃ العین کے باپ) کو ہو گئی۔ اس نے فوراً بہت بہت سے آدمی بھیجے تاکہ قرۃ العین کو راستہ ہی سے لوٹا لیں۔ یہ لوگ بڑی ہی مشکل سے اسے قزوین واپس لائے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قرۃ العین کا خاندان فرقہ بابیہ کا سخت مخالف تھا اس لئے قرۃ العین کی ان کارروائیوں نے اس کے تمامی

خویش و اقارب کو اس سے برانگیختہ کر دیا۔ اس کے عزیز اس سے برگشتہ ہوگئے اور وہ جناب تک اپنے خاندان کا گل سرسبد تھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے شوہر ملا محمد سے جو اس کا چچا زاد بھائی تھا قطع تعلق کرلینا پڑا۔

انھیں دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے قرۃ العین کا قزوین میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ مجتہد قزوین ملا محمد تقی، قرۃ العین کا چچا شروع ہی سے باب کا اور اس کی تعلیم کا سخت مخالف تھا لیکن جب اس کی پیاری بھتیجی اور عزیز بہو خود بابیوں کے زمرہ میں شامل ہوگئی اور نہایت جوش سے مذہب باب کی اشاعت میں سعی بلیغ کرنے لگی تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔

جب وہ خیال کرتا تھا کہ خود اس کے خاندان کی ایک لائق فائق عالم اور فاضل خاتون جو اس کی آنکھوں کا تارا اور خاندان کی سرتاج تھی، باب کی تعلیم کو قبول کرلی ہے اور کفر و الحاد کے پھیلانے میں اس کی شریک غالب ہوگئی ہے تو وہ آپے سے باہر ہوجاتا تھا اور جب اس کو اس کی عزیز از جان بہو اور بھتیجی کی خداداد قابلیت اور لیاقت کا خیال آتا کہ ہائے اس کے خاندان کا ایک بیش بہا زیور مفت ہاتھ سے جارہا ہے تو دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہوجاتی اور وہ خون کے

آنسو بہنے لگتا۔ اس کی بے خودی اور از خود رفتگی اور غضب و غصہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ وہ عام طور پر باب اور شیخ احمد احسائی پر لعنت بھیجنے لگا۔ بابی اس کی اس ناپسندیدہ حرکت سے سخت برافروختہ ہو گئے اور اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔

۱۸۴۷ء میں ایک روز موقع پا کر میرزا صالح نے تین چار اور بابیوں کی شرکت سے قزوین کی ایک مسجد میں ملا تقی کو قتل کر ڈالا۔ اس جرم میں کئی بابی ماخوذ ہوئے اور قتل کئے گئے میرزا صالح قید میں سے بھاگ گیا۔ ملا محمد نے اپنے باپ کے قتل کا الزام قرۃ العین پر لگایا اس لئے وہ گرفتار کر لی گئی۔ لیکن تحقیقات میں وہ سراسر بے جرم اور بالکل بے خطا ثابت ہوئی اور رہا کر دی گئی۔ اس الزام سے بری ہونے کے بعد اسے قزوین میں رہنا ناممکن معلوم ہونے لگا اس لئے اس نے اپنے پیارے وطن کو چھوڑنے پر آمادہ ہو کر خراسان کا قصد کیا۔

خراسان میں چند روز رہنے کے بعد وہ بدشت گئی اور وہاں سے مازندران پہنچی۔ اپنے نئے مذہب کی ترویج و اشاعت کا جوش اسے ایک جگہ دم نہیں لینے دیتا تھا، اور بعض جگہ ہنگامہ برپا کرنے والی مخالفتیں اسے ٹھہرنے نہیں دیتی تھیں۔ المختصر وہ کچھ دن اس شہر میں، کچھ روز اس قصبہ میں گزارتی اور وعظ کرتی پھرتی

تھی کہ انھیں دنوں میں شاہی فوج اور بابیوں میں لڑائی شروع ہوئی اس نے دورانِ جنگ میں نور میں رہنا پسند کیا اور لڑائی کے اختتام تک وہیں باطمینان رہی۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد نور کے باشندوں نے اُسے حکام کے سپرد کر دیا جنھوں نے قرۃ العین کو پابزنجیر طہران بھیج دیا ایک وقت وہ بھی تھا جب کہ وہ ایک عظیم الشان ارادے سے طہران چلی تھی اور اس کے باپ نے بہزار منت و سماجت واپس بلایا تھا، اس وقت وہ آزاد تھی لیکن اب وہ اسی بادشاہ مرحوم کے فرزند شاہ ناصر الدین قاچار کے دربار میں ایک قیدی اور مجرم کی حیثیت سے پابزنجیر شاہی گارڈ کی حراست میں پیش ہوئی۔

شاہ ایران کو اس کی حالتِ زار پر رحم اور اس کے حسن و جمال پر ترس آیا۔ لہٰذا اُس نے اس جمال صوری و معنوی سے آراستہ و پیراستہ خاتون کو بہت پیار و ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ کر فرمایا کہ مجھے اس کی صورت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ دو لیکن چونکہ بابیوں اور شاہی افواج میں لڑائی ہو کر کوئی زیادہ دن نہیں گذرے تھے اس لئے احتیاطاً قرۃ العین کو توال شہر محمد خاں کلانتر کی حفاظت میں رکھی گئی، اور ایک عرصے تک وہیں رہی۔ وہ یہاں

کسی سخت قید میں نہ تھی بلکہ اکثر بابی مختلف طریقوں سے اس سے ملتے رہتے تھے۔

وہ یہاں بھی اپنے کام سے غافل نہیں رہتی تھی اور اکثر اوقات جب کبھی شہر کی عورتیں کوتوال کے گھر میں کسی تقریب یا جشن میں جمع ہوتیں قرۃ العین اپنی پرزور فصیح تقریر شروع کر دیتی اور سبھوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ اس کا وعظ ایسا دلچسپ اور اس کا لکچر ایسا دل کش ہوتا کہ تمام سامعین پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا۔ خدائے تعلٰے نے اس کے بیان میں وہ طاقت اور زور عنایت فرمایا تھا کہ جب تک وہ لکچر دیتی حاضرین اپنے آپ کو بھی بھول جاتے۔ لیکن افسوس اُسے یہاں بھی قرار نہ ملا اور چین سے نہ رہ سکی۔

اُنھیں دِنوں میں ایک نہایت خوفناک واقعہ پیش آیا جس سے بابیوں پر مصیبتوں کی گھٹا چھا گئی۔ تمام ملک ایران میں تہلکہ مچ گیا۔ بابیوں کے مصائب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس فرقہ کے سر پر ایک بڑی آفت آئی اور بابیوں کی بربادی کے آثار نظر آنے لگے اس افسوسناک حادثہ کا اثر یہاں تک پہنچا کہ بابی ہونا سخت جرم سمجھا جانے لگا۔

وہ ہوش ربا سانحہ یہ تھا کہ ۱۸۵۲ء میں ۱۵ اگست اتوار کے

روز صبح کے وقت شاہ ناصر الدین جو اس وقت نیاوران میں جو کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے فرح کش تھے شکار کے قصد سے گھوڑے پر سوار باہر نکلے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد تین شخص عرضی دینے کے حیلے سے شاہ کے پاس آئے اور قریب پہنچ کر ایک نے پستول چلایا جو خالی گیا۔ دوسرے نے شاہ موصوف کو گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور چاہتا تھا کہ گلا کاٹ ڈالے کہ شاہی ملازمین نے پہنچ کر پھرتی سے قاتل ہی کا سر اڑا دیا اور بادشاہ کو موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ جس نے شاہ کو زمین پر دے مارا تھا اور قتل کیا چاہتا تھا وہ فتح اللہ بابی تھا اس لئے فوراً احکام جاری کئے گئے کہ تمام بابی گرفتار کر لئے جائیں اور اہل فرقہ اور اس خیال کے جتنے آدمی کیا مرد اور کیا عورت کیا بچے اور کیا بوڑھے بلا امتیاز سب یکدم گرفتار کر لئے گئے۔

اب یہ قرار پایا کہ ان میں سے جو اس خیال سے تائب ہو جائے اور باب پر لعنت بھیجے وہ چھوڑ دیا جائے اور جو ایسا کرنے میں پس و پیش کرے وہ بلا درنگ تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ان قیدیوں میں خود باب اور بابیوں کے بڑے بڑے پیشوا موجود تھے۔ اُن کے مصائب و آلام کی کوئی حد نہیں رہی تھی۔ طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں جسے یہ نامراد گروہ بخندہ پیشانی گوارا کر رہا تھا۔ لیکن اُن کے استقلال

میں ذرہ بھر فرق نہ آتا تھا۔ وہ اپنے خیالات پر ثابت قدم تھے۔ وہ اس طرح مرنے کو قابلِ فخر سمجھتے تھے اور یوں اپنی عزیز زندگی منقطع کرنے اور جانِ شیریں سے ہاتھ دھونے میں انھیں ذرا دریغ نہ تھا۔

بے چاری قرۃ العین بھی اس اثر سے بحیثیت ایک پرجوش بابی ہونے کے بچ نہ سکی اور بابیوں کے بڑے بڑے علماء کے ساتھ اسے بھی مندرجہ بالاغرض کے لئے دربار شاہی میں حاضر ہونا پڑا۔ جب محمد خاں کلانتر کو قرۃ العین کے پیش کرنے کا حکم ہوا وہ خوش خوش اپنے گھر آیا، اور قرۃ العین سے کہنے لگا کہ اب تمھاری رہائی کا زمانہ آپہنچا۔ کل صبح کو تم دربار شاہی میں اپنے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ پیش کی جاؤ گی اور تم سے صرف یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا تم بابی ہو۔ اس پر صرف تمھارے نہیں کہہ دینے "سے تمھیں چھوڑ دیا جائے گا اور اتنا کہہ دینے میں کوئی نقصان سوائے سراسر فائدے کے نہیں ہوگا۔

قرۃ العین نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ میں سمجھتی ہوں کہ کل کا دن مجھے اس سے بھی زیادہ مبارک اور نیک ہوگا جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ کیونکہ کل مجھے اپنی اس صداقت کا ثبوت دینے کا بہترین موقع ملے گا جو باب کی طرف سے میرے دل میں جلوہ افگن ہے میں ضمیر کی آزادی کو جو ایک غیر مترقبہ نعمت ہے ترک کرنا نہیں چاہتی میں تو

موت سے نہیں ڈرتی بلکہ مجھے اس طرح مرنا دل سے پسند ہے اگر میں ضمیر کے خلاف کام کروں اور تمہاری رائے پر عمل کروں تو یقیناً بچ جاؤں گی لیکن مجھے یہ منظور نہیں۔ مجھے منظور ہے کہ ضمیر کی آزادی قائم رکھنے کے لئے اپنی قیمتی اور عزیز زندگی قربان کر دوں اور اس کے بحال رکھنے کے لئے اپنی گراں قدر جان نثار کر دوں۔ لیکن مجھے یہ ہرگز منظور نہیں کہ اپنے ایمان کے خلاف کوئی کام کروں۔ محمد خاں نے بہتیرا سمجھایا لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی اور وہ اولوالعزم عورت اپنے خیال پر ثابت قدم رہی۔

دوسرا روز آیا اور قرۃ العین محمد خاں کے ہاں سے اس ستم رسیدہ گروہ میں پہنچا دی گئی جس کے ساتھ وہ دربار شاہی میں پیش ہوئی وہاں اس سے وہی سوال کیا گیا کہ کیا وہ بابی ہے۔ اس کا قرۃ العین نے نہایت بے باکانہ وہی جواب دیا جو وہ محمد خاں کلانتر کوتوال شہر سے ایک روز قبل کہہ چکی تھی اور نہایت فصاحت اور عمدگی سے اپنے عقائد بھی بیان کئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس نئے مذہب کی خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔ اس کی قدرتی فصاحت جوش زن ہوئی اور دربار میں ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کا پھر ایک دریائے فصاحت و بلاغت تھا جو بڑے زور شور سے بے اختیار امڈا چلا

آتا تھا مجلس میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ ساکت تھے۔
اس کی تقریر ختم ہونے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک یہی حالت رہی آخرکار نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ مجبوراً اس کے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ [illegible] جلادی گئی لیکن درحقیقت اس کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش باغ ایلخانی کے اندھے کنوئیں میں ڈال دی گئی اور اوپر سے پتھر بھر دئے گئے۔

یوں اس لائق ہوشیار ثابت قدم اور خوب صورت خاتون کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس کی موت نہایت ہیبت ناک تھی مگر وہ اپنی اس بہادرانہ موت سے دنیا کو ایک اعلیٰ درجہ کی شجاعت و جواں مردی کا نمونہ دکھلا گئی۔ اس کی ایسی افسوسناک موت نے اس کے فضائل پر کوئی پردہ نہیں ڈالا بلکہ اس سے اس کی عظمت اور عزت اور بھی دوبالا ہوگئی اس معزز اور فخر بنی نوع انسان خاتون کی قابلیت اور خوبی کی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گی اور اس جوانمرد عورت کا نام ہمیشہ دلی عظمت کے ساتھ لیا جائے گا۔ لوگ اس کی ہمت و استقلال اور اس کی لیاقت و قابلیت کے ثنا خواں رہیں گے اور اس کے کارناموں کو دیکھ کر وجد کریں گے۔

فطرت نے قرۃ العین کو نہایت فیاضی سے جہاں جمال صورت دی

معنوی سے ہر طرح آراستہ فرمایا تھا اور بے نظیر قابلیت لیاقت برگزیدہ صفات۔ بڑی بڑی خوبیاں عنایت فرمائی تھیں وہاں اُسے شاعرانہ طبیعت بھی عطا فرمائی تھی لیکن افسوس کہ اس کا کلام بالکل تلف ہو گیا۔ ہم ذیل میں اس کی تین غزلیں درج کرتے ہیں جو ہزار کوشش ہاتھ آئی ہیں۔

وَھُوَ ھٰذا

جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا
ہمہ عاشقاں شکستہ دل کہ دہند جاں برہِ دلا

اگر آں صنم ز سرِ ستم پے کشتنِ من بے گناہ
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضا

سحر آں نگار ستمگرم قدمے نہادہ بہ بسترم
وَاِذَا رَاَیت جمالہٗ طلع الصباح کانما

نہ چو زلفِ غالیہ بار او نہ چو چشمِ فتنہ شعار او
شدہ ناقۂ ہمہ ختن شدہ کافرے بہمہ خطا

تو کہ غافل از مئ شاہدی پے مرد عابد و زاہدی
چکنم کہ کافر جاحدی ز خلوص نیت اصفیا

بمراد زلف معلقی پے اسپ و زیں معرقی

ہمہ عمر منکرِ مطلقی ز فقیر فارغ بے نوا
تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری
اگر آں خوش است تو در خوری و گر ایں بست مرا سزا
بگذر ز منزلِ ما و من بگزیں بملکِ فنا وطن
فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشا

دیگر

لمعات وجہک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا
ز چہ رو الست بربکم نہ زنی بزن کہ بلے بلے
بجواب طبل الست تو ز ولا چو کوس بلا زدند
ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا
من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو زد صلائے بلا برو
بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا
چو شنید نالہ مرگ من پے ساز من شد و برگ من
فمشے الی مہرولا و بکے علی مجلجلا
چہ شدہ کہ آتش جہلے زنم لقلۂ طور دل
فلکنتہ و دکّتہ متدکدگاً متزلزلا
پے خوان دعوت عشق او ہمہ شب ز خیل کر دیاں

رسد ایں صفیر ہمینے گر گروہ غم زدہ الصلا
تو کہ فلس ماہیئے حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بہ نشیں چو طاہرہ دمبدم بشنو خروش نہنگ لا

دیگر

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رو برو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو
از پے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو
میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بجو
دور دہان تنگ تو عارض عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو
مہر ترا دل حزیں بافتہ بر قماش جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو
در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

عزیز النساء بیگم

عزیز النساء خواجہ فرید الدین احمد دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ وزیر اعظم اکبر شاہ ثانی کی بڑی صاحبزادی اور فدائے قوم سر سید مرحوم کی والدہ معظمہ تھیں۔

عزیز النساء نہایت لائق، عقل مند و عالی دماغ بی بی تھیں۔ قرآن مجید با معنی کسی قدر فارسی پڑھی ہوئی تھیں۔ عربی خط لکھ سکتی تھیں لیکن بول بہت کم سکتی تھی۔ اپنی نواسیوں اور پوتیوں کو انھوں نے خود قرآن مجید اور معنے وغیرہ پڑھائے۔ اور بعض کو تھوڑی سی فارسی بھی پڑھائی۔ جب کوئی بچہ اُن کو سبق سُناتا تھا، یا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ تین سوت کی لڑیں جو ایک لکڑی میں بندھی ہوئی تھیں۔ اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں لیکن کبھی مارتی نہ تھیں۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا۔ روپیہ، پیسہ گاؤں کا یا دیہات کا غلہ، مکانوں کا کرایہ، قلعہ کی تنخواہ، باغوں کا میوہ وغیرہ سب میں سے بحساب پانچ فی صدی کے خدا کے نام پر علیحدہ کرتی تھیں۔ اور

اپنی بہنوں، بھانجیوں غرضکہ کل کنبے پر تاکید تھی کہ اسی طرح پانچ فی صدی کے حساب سے خدا کی راہ پر دیا کریں۔ جس قدر روپیہ اس طرح جمع ہوتا تھا اس سے غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتی تھیں امداد کرتی تھیں۔ جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے نکاح کراتی تھیں۔ اور مفلس و غریب خاندانوں کی جو لڑکیاں جوان ہوتی تھیں اور بیوہ ہو جاتی تھیں ان کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں۔

غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ طور پر یا کسی حیلے سے اُن کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسی عورتوں سے شادی کی تھی جن سے ملنا لوگ معیوب سمجھتے۔ مگر ان کا قول تھا کہ حکم خدا سے صلہ رحم سب پر مقدم ہے۔ وہ خود ان کے گھر جاتیں، ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں اور سلوک کرتیں۔

تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک، نذر و نیاز، منت وغیرہ پر اُن کو بالکل اعتقاد نہیں تھا بلکہ وہ اس پر ایمان رکھنا شرک اور خدا پر ایمان رکھنے کے بالکل خلاف سمجھتی تھیں۔ انھوں نے کبھی کوئی منت یا نذر و نیاز کسی کے لیے نہیں مانی اور نہ کبھی تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اعتقاد رکھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ شاہ غلام علی صاحب کی مرید تھیں۔

باوجودیکہ ان کا تمام خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب کا مرید تھا اُن کے ہاں تعویذ گنڈوں کا چرچا تھا۔ لیکن شاہ غلام علی صاحب کے ہاں اس قسم کا چرچا بالکل نہیں تھا۔ جب کوئی ان کے پاس حاجت لے جاتا تو وہ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے اور سب حاضرین سے کہتے "دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے" یہی عقیدہ عزیز النساء کا بھی مستحکم تھا۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا اُن سے ظہور میں آیا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس قدر صابر مستقل مزاج و فرشتہ خصلت بی بی تھیں) وہ نہایت ہی عجیب ہے اور بہت ہی کم اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ سید محمد خاں اُن کے بڑے بیٹے نے ۳۹ (اُنتیس) سال کی عمر میں انتقال کیا وہ اُن کے زمانہ بیماری میں ہمیشہ اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ آخر ایک دن وقت صبح اُن کا انتقال ہوگیا۔ سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ جو رنج والم اُن کو ہوا ہوگا ظاہر ہے اُن سے زیادہ کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ بے اختیار اُن کی آنکھوں سے اشک جاری تھے مگر اسی حالت میں اُنھوں نے کہا کہ "خدا کی مرضی" اور اُٹھ کر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ اشراق تک مصلے ہی پر بیٹھی رہیں۔ اتفاق سے اُن کے کسی رشتہ دار کی لڑکی کی شادی اسی زمانے

ٹھہر چکی تھی۔ سب سامان شادی کا ہو گیا تھا کہ یہ حادثہ گذرا۔ موافق دستور کے ان لوگوں نے شادی ملتوی کرنا چاہی۔ لیکن جب اُنھوں نے سُنا تو تیسرے دن بیٹے کے انتقال کے اور ایسے صدمے کے اُن کے گھر گئیں اور کہا کہ "میں شادی میں آئی ہوں کیونکہ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا جو امر خدا کو منظور تھا وہ تو ہو گیا۔ اب شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ میں خود تمھارے گھر شادی میں آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں۔ تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے"۔

اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عزیز النساء کس قدر عالی دماغ، نیک صفات، عمدہ اخلاق، دانش مند، دور اندیش فرشتہ خصلت بی بی تھیں۔ ایسی ماں کا ایک بڑے بیٹے پر جس کی اس نے تربیت کی ہو کیسا اثر پڑتا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی نیک بی بی کو اخیر عمر میں تکلیف پہنچی وہ زمانہ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجاویں گے۔ تم سب اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے انگریز اُن کو کچھ نہیں کہنے کے

ان کو یقین کامل تھا کہ انگریز بجز اُن کے جنھوں نے فساد کیا ہے

کسی کو تکلیف نہیں دینے کے"۔ جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے لیکن وہ اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے مع اپنی بہن کے جو نابینا تھیں اپنے گھر سے نہیں نکلیں مگر افسوس ان کا خیال غلط نکلا، اور جب دہلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا وہ مع اپنی بہن کے گھر کو چھوڑ کر اس کوٹھری میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن انھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔

اس عرصے میں سر سید جو میرٹھ آ گئے تھے ۔ میرٹھ سے دہلی پہنچے اور اُن کے پاس گئے ۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا اور بہت تکلیف تھی سر سید لکھتے ہیں کہ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں تم یہاں کہاں آ گئے۔ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گذرے گی گذرے گی"۔

میں نے کہا کہ آپ جمع خاطر رکھئے۔ مجھے کوئی نہیں مارے گا میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں، ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے

پانی مطلق نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار قلعہ سے ایک صراحی پانی کی لے کر گھر گیا۔ اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے خدا کا شکر کیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں۔ میرٹھ لے جانے کے لئے سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے لیکن کہیں سواری نہیں ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی۔ کہ شکرم جو سرکاری ڈاک لے کر میرٹھ کو جاتی ہے مجھ کو دے دی جائے میں شکرم لے کر گھر پر آیا۔ اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر لایا۔

اس تکلیف سے ان کو صفرا کی نہایت شدت ہو گئی جو دوا یا غذا دی جاتی تھی قے ہو جاتی تھی۔ آخر کار اسی مرض میں یکم ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء کے بمقام میرٹھ انھوں نے انتقال کیا۔

عزیز النساء بیگم صاحبہ کی چند نصیحتیں۔

دکھ بیماری میں علاج کرنا، دوا دینا صرف ایک حیلہ ہے شفا دینے والا خدا ہے۔ اگر دوا اور حکیموں کے علاج سے لوگ مرا نہ کرتے تو سب لوگ خدا کو بھول جاتے۔

۲۔ اگر سیتلا کے پوجنے سے لڑکے، لڑکیاں سیتلا کی بیماری

سے نہ مرتے تو تمام دنیا بجز اُن کے حق کو خدا بجانتا کافر ہو جاتی۔

۳۔ منت نذر و نیاز تعویذ گنڈا کرنا۔ خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔

۴۔ ہر بات میں خدا سے دعا کرنی چاہیئے۔ وہی جو چاہے گا کرے گا۔

۵۔ مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں۔ ان میں بھی کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے۔ لیکن بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

۶۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے۔ اور کبھی کچھ ہے۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔

۷۔ جہاں دوستی ہے۔ اس کو پورا کرنا چاہیئے۔ یہ تمھارا فرض ہے اس دوست کو دوستی کا پورا کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے ذمہ دار مت ہو تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے اس سے تم کو کیا۔ کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔ چاہے وہ دوست بے اتفاقی سے پیش آئے تو تم مت اس کے ساتھ بے اتفاقی سے پیش آؤ۔

۸۔ اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ بھلائی کی ہو۔ اور دو دفعہ برائی کرے۔ تو تم کو

آزردہ نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ایک دفعہ کی نیکی اور ایک دفعہ کی بھلائی یا دو دفعہ کی نیکی اور دو دفعہ کی برائی برابر ہوگی۔ مگر نیکی ایسی چیز ہے کہ اس کے بعد نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے، اُس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔



فاطمہ علیہ خانم

فاطمہ علیہ سلطنت ٹرکی کے سابق ناظر عدالت اور مشہور مورخ جودت پاشا کی بیٹی ہے۔ اکتوبر [illegible] ۱۸۶۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئی ابھی تین برس کی عمر تھی کہ باپ ولایت حلب کا حاکم مقرر ہوا۔ ہونہار بیٹی کی لیاقت و شرافت کے آثار اول ہی سے ایسے ظاہر تھے کہ باپ اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ حلب جلتے وقت اپنی جگر گوشہ کو قسطنطنیہ میں چھوڑ جانا اس کا دل گوارا نہ کر سکا آخر اپنے ساتھ اس کو بھی لے گیا دو برس جب تک وہاں حاکم رہا اپنے ساتھ رکھا۔ بعد دو برس کے جب پھر قسطنطنیہ کی تبدیلی ہوئی اور پھر واپس آیا تو چند لائق استادوں اور استانیوں کو فاطمہ کی تعلیم کے لئے مقرر کیا اور خود اپنے سرکاری کاموں میں جو نہایت ذمہ داری کے تھے مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ بیٹی کی عمر اب چودہ سال کی ہوئی جب وہ لاتیہ یانیہ کی حکومت پر سرفراز ہوا یہ بھی اس کے ہمراہ گئی لیکن اب کے زیادہ عرصہ تک ساتھ نہ رہ سکی۔ تھوڑے عرصے کے بعد باپ پھر قسطنطنیہ کو واپس بلا لیا گیا اور حکومت سے یا اس کو تفویض ہوئی۔ فاطمہ پھر اس کے ساتھ گئی اور ایک معقول مدت تک دمشق و شام میں رہی ایک موسم جاڑے کا

بیروت میں بھی بسر ہوا بعد اس کے اپنے باپ کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس آئی۔

چھوٹی عمر میں قرأت کے اصول اور لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ترکی کتابوں کے ساتھ عربی، فارسی بھی لائق استادوں سے پڑھتی رہی اور ان زبانوں کے حاصل کرنے کے بعد پیرس کی ایک معلّمہ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں کمال پیدا کیا جس وقت کہ اپنے باپ کے ساتھ ولایت سوریہ کا سفر کیا ہے علم و ادب کی تمام شاخوں یعنی بدیع، بیان، عروض، نحو وغیرہ کی تحصیل میں مصروف تھی علوم عقلیہ یعنی توحید، کلام، منطق، ریاضی، اور حساب اپنے باپ ہی سے پڑھتی رہی علم موسیقی کے تمام انواع یعنی اصول و فروع کو بڑے بڑے ماہرین فن ترک عرب، فرانسیسی اور ایرانیوں سے حاصل کیا اور وہ ملکہ بہم پہنچایا کہ تمام زمانہ اس کے کمال کو مانتا ہے

ان مختلف علوم کی شاخوں میں مہارت و کمال حاصل کرنے میں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امور خانہ داری کی تعلیم اور تجربے کا اُسے موقع نہ ہوا ہوگا نہیں تو اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتونوں کے اس زیور سے بھی آراستہ ہے اور تمام امور خانہ داری میں اس کو ایسا سلیقہ حاصل ہے کہ اپنے ہمسروں اور قرب و جوار کی شریف خاتونوں پر اس کی فوقیت مسلّم ہے

علم انشاء اور کلام میں اس محترم خاتون کا کمال اس درجے کا ہے

کہ ایک خاص طریقے کی موجد ہے۔ مگر چونکہ ابتدا میں وہ چند ایسے اشغال میں جو مستورات کی زندگی کا لازمہ ہیں۔ زیادہ مشغول رہی۔ اس لئے اپنی تصانیف کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ نہ کرسکی۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان حمید خاں ثانی کا عہد حکومت شروع ہوا جو ترکوں میں علوم وفنون کی اشاعت اور چرچے کے لئے بڑا مبارک زمانہ خیال کیا جاتا ہے خصوصاً دار السلطنت قسطنطنیہ میں علوم وفنون کی ہر طرح کی رونق اور گرم بازاری جب ترقی کے اعلیٰ زینے پر پہنچی تو بعض خاتونیں بھی آثار علمی کی اشاعت اور تصنیف وتالیف میں حصہ لینے لگیں، اُن کے مقابلے میں فاطمہ علیہ نے بھی اپنی لیاقت وکمال کے جوہر دکھلانے شروع کئے اور ان میں سبقت حاصل کرنے کے واسطے پہلا کام فاطمہ علیہ نے فرانس کے ایک نامی مصنف اور مشہور دیب جارج اونا کی ایک فرانسیسی تالیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور ترجمے کا نام "مرام" رکھا۔

یہ ترجمہ اس عمدگی کے ساتھ انجام دیا ہے کہ اصل کتاب کا اسلوب اور سیاق عبارت ترکی میں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور ترجمہ ترکی میں اصل تالیف کے برابر لطیف ہے۔ یہ ترجمہ اس کے علم وفضل کا پہلا نمونہ ہے۔ مگر بہ نظر حجاب اس میں اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

نام چھپانے سے شاید یہ مطلب بھی ہو کہ ترجمہ کی نسبت پہلے اس زمانے کے علماء اور ادیبوں کی رائے دریافت کرے۔ چنانچہ ترجمہ ابھی پورا نہیں چھپا تھا چند جزو شائع ہوئے تھے کہ ترکی میں نئی روشنی کے آدمیوں نے جو وہاں طرزِ جدید کے موجد کہلائے جاتے ہیں اس کی نسبت اپنی پسندیدگی کی رائے ظاہر کرنی شروع کی۔ علامہ مدحت آفندی نے جو ترجمان حقیقت کے مہتمم ہیں تمام ترجمے کے ابواب کو شائع کیا اور صاحبانِ علم و فضل کو اس طرف شوق دلایا۔ چونکہ مترجم کا نام معلوم نہ تھا اور ترجمہ ایسا نایاب تھا کہ اخبارات اور رسالوں میں بہت دن تک سلطنت عثمانیہ کے آدمیوں میں مترجم کے متعلق اٹکل پچو بحثیں ہوتی رہیں۔ مگر احمد مدحت آفندی وغیرہ ترکی فاضلوں کی کوشش نے آخر اس نام کو پردہ سے نکالا اور دنیا پر ثابت ہو گیا کہ جارج اونا کے مشہور و معروف رسالے کا کوئی مترجم نہیں ہے بلکہ مترجمہ ہے اور وہ جودت پاشا کی بیٹی فاطمہ علیہ ہے۔

ترکی کے مشہور مصنف احمد مدحت آفندی کے اصرار پر اور کمال خوشنودی ظاہر کرنے پر فاضل مترجمہ نے اپنا نام ظاہر کیا اور اس سے بہت علمی مباحثے کئے جن میں متعدد مقالے لکھے گئے اور ترجمان حقیقت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے تھے۔ اس ذریعے سے اور بھی زیادہ

فاطمہ علیہ کی شہرت اس کے معاصرین میں ہوئی۔ جب یورپ کے تمام ملکوں میں اس کی شہرت کا آوازہ پہنچا اور پیرس کی سیاح لیڈیوں نے اس کے حالات سُنے تو جب کبھی کوئی یورپ کی فاضلہ حرم سُلطانی کی بیگمات اور خواتین سے ملنے کے لئے آتی تو وہ فاطمہ علیہ سے بھی ضرور ملتی اور فاطمہ علیہ اور ان سیاح لیڈیوں میں ایسے علمی تذکرے اور باتیں ہوتیں کہ جن سے اس کی فضیلت کا نقش ان کے دلوں پر جم جاتا۔

فاطمہ علیہ اور پیرس کی تین فاضلہ سیاح لیڈیوں میں چند بڑے بڑے مباحثے ہوئے ہیں جن کو فاطمہ نے ایک رسالہ کی صورت میں لکھ کر شائع کیا ہے اور اس کا نام "نساء الاسلام" رکھا ہے۔

یہ رسالہ پہلے ترجمان حقیقت ایک اخبار میں شائع ہوا اور اس کے بعد ثمرات الفنون نے جو بیروت سے نکلتا ہے ترکی سے عربی میں ترجمہ کرکے چھاپا۔ اردو، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے جس سے فاطمہ کے نام اور شہرت کو اور رونق ہوئی۔

یہ رسالہ ان تصنیفوں میں جو پردہ نشین خواتین کی طرف سے آج تک شائع ہوئے ہیں سب سے اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اس کو مصنفہ

کے حسنِ بلاغت اور اعلیٰ درجہ کی طباعی کا نمونہ خیال کرنا چاہیے۔ ایک اور تصنیف اس کی بنام "محاضرات" عثمانی ترکوں کے حالات میں شائع ہوئی ہے۔

خدا نے اس فاضلہ مصنفہ کو نہ صرف ریاضی و فلسفہ طبیعیات تاریخ موسیقی وغیرہ علوم اور مختلف زبانوں کی مہارت سے بہرہ مند فرمایا ہے بلکہ علوم مشرقی اور مغربی کے باہم میل جول سے جو اس کی ذات اور لیاقت میں یک جا موجود ہیں، ایک خاص جدّت اور طرز اس کی تصنیفات میں پیدا کر دی ہے جو اس کے وجود کو پردہ نشین خواتین اسلام میں قابلِ ناز اور باعثِ فخر قرار دیتی ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ جامع علوم مشرقی و مغربی ہے، اس کو یورپ کی فاضلہ عورتوں پر بھی فوقیت دی جا سکتی ہے۔

تمت

خواتین

جس میں ۳۳ مشہور اسلامی خواتین کی سوانح عمریاں
اور اُن کے مفید و مستند تاریخی حالات ہیں جو وقتاً
فوقتاً دس سال تک علی گڈھ کے رسالہ خاتون میں شائع
ہوتے رہے۔

مؤلفہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

سنگم کتاب گھر
اُردو بازار دہلی